بزم بے تکلّف

از

ڈاکٹر سید عابد حسین

ناشر

سنگم کتاب گھر

اردو بازار دہلی

بار اوّل ۱۰۰۰

قیمت ۱۲؍

یونین پرنٹنگ پریس، دہلی

فہرست مضامین

صالحہ کی نذر

جن کی رفاقت نے

اور منزلوں کی طرح اس منزل کو بھی

آسان کر دیا۔

احوالِ واقعی

کی گذارش بھی منظور ہے اور اپنے حسنِ طبیعت کا بیان بھی۔ ستمبر ۱۹۴۷ء کو دلی میں جو قیامت صغریٰ برپا ہوئی تھی اس کا ذکر دور سے میں نے پونا میں سُنا جہاں بڑی سالانہ تعطیل بسر کرنے گیا تھا مصیبتیں زندگی میں بہت دیکھی تھیں اور تھوڑی بہت اُٹھائی بھی تھیں مگر یہ مصیبت ایسی تھی جس نے نہ صرف ہاتھ پاؤں، دل و دماغ کو شل کر دیا بلکہ ایمان کی جڑوں کو ہلا دیا یعنی خدا پر اور انسان پر جو تکیہ بھروسہ تھا وہ بودا ہوگیا۔ اس وقت سے شروع جنوری ۱۹۴۸ء تک جب مجھے جامعہ نگر پہنچ کر برادرانِ جامعہ سے ملنا نصیب ہوا، چلنا، پھرنا، کھانا پینا، زندگی کی ظاہری علامتیں موجود تھیں مگر ذہن اور روح پر ایک مردنی سی چھا کر رہ گئی تھی۔ جامعہ میں آنے کے بعد سخت جان اور سخت ایمان ساتھیوں کی صحبت نے دل میں کچھ گرمی پیدا کی اور پھر ۳۰ جنوری کو گاندھی جی کی سانحات نے تو روحانی جمود کو گہرے اور سچے غم کی آگ میں پگھلا کر رکھ دیا۔ مایوسی کا زہریلا اثر دور ہوا اور دماغ نے کام کرنا شروع کیا تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ جو اندھیر تقسیم ہند کے بعد مچا ہے وہ عارضی جنون اور مستقل جہالت کا نتیجہ ہے۔ جنون کا طلسم تو گاندھی جی کی موت نے توڑ دیا۔ اب ہم لوگوں کو جہالت

کے اندھیرے سے نبٹنا ہے چنانچہ میں نے ایک ہفتہ وار اخبار "نئی روشنی" کے نام سے نکالنے کا ارادہ کیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ مذہب، سیاست، معیشت غرض زندگی کے ہر شعبے کو عہد وسطیٰ کی تاریک خیالی سے جو ابتک ہمارے ملک پر طاری ہے نجات دی جائے۔ اس اخبار کا پہلا پرچہ ۱۶ رجون ۱۹۴۸ء کو یعنی عین اس روز نکلا جس کے بارے میں سارے ہندوستان اور پاکستان میں ایک مدت سے یہ خبر گرم تھی کہ سچ مچ قیامت کا دن ہوگا۔ اس اخبار نے اپنی سوا دو برس کی مختصر زندگی میں علم و عقل کی روشنی پھیلا کر ملک و قوم کی جو خدمت کی اس کا اہل نظر اعتراف کر چکے ہیں۔ خاصکر اسکے مزاحیہ کالم نے جو ہر ہفتے "بزم بے تکلف" کے عنوان کے تحت اہل ذوق کو محظوظ کرتا تھا، اس ناہموار زمانے میں احساس تناسب اور ذہنی توازن پیدا کرنے میں بڑی مدد کی۔

ستمبر ۱۹۵۰ء سے جب "نئی روشنی" کو مالی مشکلات کی وجہ سے بند کرنا پڑا۔ احباب کا تقاضا تھا کہ "بزم بے تکلف" کا پورا ذخیرہ مجموعۂ مضامین کی شکل میں شایع کیا جائے۔ خدا خدا کر کے اب یہ فرمائش پوری کرنے کی نوبت آئی ہے۔ مگر اس طرح کہ سب مضامین کے بجائے صرف چیدہ مضامین چند عنوانات کے ماتحت شایع کئے گئے ہیں۔ ہر مضمون کی نئی روشنی میں اشاعت کی تاریخ بھی دیدی گئی ہے تاکہ پڑھنے والوں کا ذہن ان واقعات کی طرف زیادہ آسانی سے منتقل ہو سکے جو اس مضمون کے لکھنے کے محرک ہوئے۔ اس مختصر تمہید کے ساتھ یہ خوان یغما حاضر ہے۔ ع

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کیلئے

سید عابد حسین

حضرت انسان

حضرت انسان

(۱۶ر جون ۱۹۴۸ء)

آج کل ایک سرے سے ساری دُنیا فکر و پریشانی، خوف و ہراس، غم و غصے میں مبتلا ہے۔ ایک لڑائی کا بخار اُترنے کے بعد انسانیت کے جوڑ جوڑ میں درد ہے منہ کا مزا کڑوا ہے، مزاج بدچڑا ہے اور دوسری لڑائی کا جاڑا چڑھنا شروع ہوگیا ہے۔ ہندوستان اس جاڑے بخار سے تو سستا چھوٹ گیا تھا مگر یکایک سیاسی موسم بدلنے سے فرقہ پرستی کا مواد اس طرح ابھر آیا کہ پرانے فساد خون نے شدید زہرباد کی صورت اختیار کرلی اور عمل جراحی کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اس آپریشن کے بعد بدن کا زخم اور دل کا زخم ابھی تک بھرنے نہیں پایا ہے اور طاقت بھی پوری طرح نہیں آئی ہے۔ طبیب کہتے ہیں کہ صحت پانے کے لئے ضروری ہے کہ مریض ہنستا بولتا رہے، خوش و خرم رہے۔

سوال یہ ہے کہ اس زمانے میں، اس فضا میں کوئی بھلا آدمی کیونکر خوش

رہ سکتا ہے خصوصاً ہندوستان میں جہاں ایک کروڑ سے زیادہ آدمی جڑ سے اکھڑ گئے ہیں اور کئی کروڑ کی جڑیں ہل گئی ہیں، بہت سے خود دکھ بھر رہے ہیں اور بہت سے اپنے بھائیوں کی مصیبت دیکھ کر کڑھ رہے ہیں۔ ایسے وقت میں ہنسی تو ایک طرف مسکراہٹ بھی بے حیائی، بے حسی، بے دردی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ بے فکری اور اوچھے پن کی ہنسی کے علاوہ ایک اور ہنسی بھی ہوتی ہے، جو گہرے ایمان، پکے ارادے اور بلند حوصلے کی نشانی ہے۔ جو شخص خدا کی خدائی اور انسان کی انسانیت پر ایمان رکھتا ہے، جو دنیا کی مشکلوں اور مصیبتوں سے لڑنے کا ارادہ اور ان پر غالب آنے کا حوصلہ رکھتا ہے وہ شدید رنج و الم کو خوش مزاجی اور خوش وقتی کے پردے میں چھپا سکتا ہے اور چھپاتا ہے۔ اس کا دل روتا ہے۔ مگر چہرہ ہنستا رہتا ہے۔ اسی کیفیت کا نقشہ غالب نے چند لفظوں میں کھینچا ہے ع

دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

ظرافت یا خوش طبعی جو انسان کو ہنسنے ہنسانے پر ابھارتی ہے، قدرت کی بہت بڑی نعمت ہے۔ دراصل یہ احساسِ تناسب کی صفت ہے اور اسے تہذیب یا کلچر کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ جس میں احساسِ ظرافت ہوتا ہے اس کی نظر میں ہر قسم کی بے اعتدالی، بے تکا پن، بھونڈا پن فوراً کھٹکتا ہے۔ وہ ان چیزوں پر خود ہنستا ہے اور دوسروں کو ہنساتا ہے۔ اس طرح وہ ایک طرف الم ہستی کے بوجھ کو ہلکا کرتا ہے اور دوسری طرف لوگوں کو اُن کے عیوب کی طرف توجہ دلا کر اصلاح کا موقع دیتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ ظرافت

کا استعمال بے دردی سے نہیں ہمدردی سے کیا جائے۔ یہ نہ ہو کہ جس پر ہم ہنسیں اسے رُلا دیں۔ اس سے تو ضد اور عداوت پیدا ہوتی ہے۔ ظرافت کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ جس کی ہنسی اُڑائی جائے وہ خود بھی ہنس پڑے اور جھینپ کر کہے " بھئی بات تو ٹھیک ہے "! یہ ہمدردی کا جذبہ اس وقت نمایاں ہوتا ہے، جب ہم اپنے آپ کو اپنی ظرافت کا نشانہ بناتے ہیں۔ اپنے اوپر ہنسنے میں ہمارا انداز یہ ہوتا ہے کہ ہماری یہ حرکت تو واقعی بے تکی تھی مگر یوں ہم آدمی اچھے ہیں۔ یہی انداز سب کے ساتھ ہونا چاہئے۔ صحیح احساسِ ظرافت یا احساسِ تناسب رکھنے والا جانتا ہے کہ دنیا میں سراسر اچھا یا سراسر بُرا کوئی نہیں ہوتا۔

بالقوۃ سب انسان اچھے ہیں یعنی سب میں اچھا بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ البتہ بالفعل ہر شخص خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ہماری ظرافت عموماً اس کی خامیوں کو دکھاتی ہے لیکن اگر پس منظر میں اس کی خوبیاں بھی دکھا دی جائیں تو نقش زیادہ اُبھر آتا ہے۔ دھوپ چھاؤں کا کھیل تصویر میں جان ڈال دیتا ہے۔

مثلاً ہمارے دوست سر اے۔ بی۔ سی۔ کو لے لیجئے۔ بچارے کچھ عرصے سے اپنے خوش طبع حریفوں کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں۔ پچھلے سال جب خطابوں کی آخری فہرست میں انھیں سر کا خطاب ملا تو ایک دلگی باز نے کہا۔

لے لو سر کا خطاب اے۔ بی۔ سی۔ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہے

جھنڈے کی سلامی کی رسم ادا کی تو ایک بگڑے دل نے فقرہ کسا۔

پرجا کا سلامی بھی ہے سرکار کا سر بھی
اے تھالی کے بینگن تو ادھر بھی ہے اُدھر بھی

اسی طرح بچارے کی اس بات پر کہ پہلے اپ ٹوڈیٹ انگریزی لباس ڈانٹ کر ولائتی شان سے اکڑتے تھے اور اب شدھ کھدر کے کپڑے پہن کر دیسی انداز میں برتے ہیں، طرح طرح کی پھبتیاں کسی جاتی ہیں۔ کوئی پکارتا ہے ع

او زمانے کی طرح رنگ بدلنے والے

کوئی میاں خوجی کے الفاظ میں کہتا ہے۔

پہچان لیا بہروپیا ہے

کوئی ان کو سنا کر کسی سے پوچھتا ہے "کیوں بھئی کون سے دانت کھانے کے ہیں کون سے دکھانے کے"

ان باتوں کو سن کر آپ کے ذہن میں ان کی تصویر کچھ اس قسم کی آئیگی کہ ایک دھڑ ہے دو سر ہیں۔ ایک سر ہیٹ سے آراستہ ہے، دوسرا گاندھی ٹوپی ہے۔ ایک ہاتھ میں یونین جیک ہے۔ دوسرے میں قومی جھنڈا۔ آدھے بدن پر کوٹ آدھے پر کرتا، ایک ٹانگ میں پتلون کا پائینچہ، ایک میں دیسی پاجامہ کا، ایک پاؤں میں ولائتی شو ہے ایک میں چپل۔ مگر یہ تو للو کے دہپر کا سا خاکہ ہوا انسان کی تصویر نہ ہوئی۔ آیئے ہم آپ کو ان کی سیرت کا ایک روشن رخ بھی دکھاتے ہیں، تاکہ دھوپ چھاؤں کے صحیح تناسب سے آپ

اُن کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ سکیں۔

سر اے۔ بی۔ سی کی سیرت کی سب سے نمایاں خصوصیت ہمدردی کا مادہ ہے جس کی عمومیت کی کوئی حد نہیں، بچپن میں ان کے ماں باپ میں بتقاضائے محبت ہمیشہ آپس میں جوتی پیزار رہتی تھی، ننھا اے۔ بی سی اس وقت تک سر نہیں ہوا تھا مگر

بالائے سرش ز ہوشمندی

می تافت ستارۂ بلندی

وہ جوش الفت میں دونوں سے الگ الگ بے حد ہمدردی کا اظہار کرتا، ایک کے سامنے دوسرے کو بُرا کہہ کر اس کے زخم دل پر مرہم رکھتا اور دونوں سے پیسے لے کر اپنا غم غلط کرنے کو مٹھائی کھا لیتا۔ وہ بڑا ہو کر مدرسے میں داخل ہوا تو وہاں بھی اس کی ہمدردی کا یہی حال تھا۔ دو لڑکوں میں لڑائی ہو تو وہ دونوں کا غمخوار، اُستادوں اور طالب علموں میں کشمکش ہو تو فریقین کا مشیر کار بن جاتا تھا۔

جب اے۔ بی۔ سی نے بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ہو کر پبلک لائف میں قدم رکھا تو ان کے ہمدردی کے جذبے کو اپنے اظہار کے لئے اور زیادہ وسیع میدان مل گیا۔ وہ ایک امیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے ہاں اللہ کا دیا یعنی اللہ کے غریب بندوں سے لیا ہوا، سب کچھ موجود تھا اور انھیں کسب معاش میں جان کھپانے کی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے انھوں نے اپنے آپ کو ملک و قوم کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ انھوں

نے دیکھا ہندوستان کو سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی شخص
راعی اور رعایا کے بیچ میں پڑے اور اس بات کی کوشش کرے کہ دونوں
ایک دوسرے سے نہ سہی کم سے کم اسی سے خوش رہیں۔ اے۔ بی بھی جانتے
تھے کہ دل کو دل سے راہ ہو یا نہ ہو مگر دل کو پیٹ سے ضرور راہ ہے چنانچہ
وہ قومی خدمت کے لئے پبلک پلیٹ فارم اور لکھنے کی میز سے زیادہ کھانے
کی میز سے کام لیتے تھے۔ اکبر مرحوم نے ان ہی کی شان میں کہا تھا۔ ع

قوم کے غم میں ڈنر کھاتا ہے حکام کے ساتھ

لیکن یہ مصرعہ صرف معاملے کے ایک پہلو کو ظاہر کرتا ہے۔ اے۔ بی
سی صرف حکام بالا دست ہی کی دعوتیں نہیں کرتے تھے بلکہ حکام زبردست یعنی
شکمی لیڈروں کے غذائی مسئلے کو حل کرنے میں بھی حصہ لیتے تھے۔ جب راشننگ
کا دور آیا اور ہم کو آپ کو آدھے پیٹ آٹا اور ایک دانہ شکر ملنے لگی تو
اے۔ بی۔ سی کو بڑی مشکل پیش آئی۔ مگر ان کی طبع رسا نے اس کا یہ حل نکالا کہ چور
بازاری کے انسداد کا بیڑہ اٹھا لیا اور محکمہ غذا کے عمال کے ساتھ ملکر ناجائز
ذخیروں کو بہ حقِ افسرانِ سرکار اور بہ حقِ لیڈرانِ قوم ضبط کرنے لگے۔ چور بازار
خالی کر کے چور معدوں کو پُر کرنے کی خدمت انھوں نے بڑی تندہی سے بغیر
کسی معاوضے کے برسوں تک انجام دی۔ اسی کے صلے میں سرکار ابد قرار
نے ان کو سر کے خطاب سے سرفراز کیا۔

مگر افسوس ع سر منڈاتے ہی پڑ گئے اولے۔ یعنی ان کے سر ہوتے
ہی سرکار ابد قرار سر پہ پاؤں رکھ کر فرار ہو گئی، وہ سر جو زیبِ تن ہوتا اب

وبالِ دوش ہوگیا۔ اب بے چارے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ دو طرح کے ملاقاتی کارڈ رکھیں۔ ایک پر "سر اے۔ بی۔ سی۔ کٹ" اور دوسرے پر خادم قوم اے۔ بی۔ سی" چھپوائیں، انگریزی وضع کے کپڑے تو بہت تھے۔ اب اس مہنگائی کے زمانے میں شدہ کھدر کے کپڑے جن میں تراش کم اور خراش زیادہ ہوتی ہے، بنوانے پڑے۔ آپ ان کی دو رنگی پہ ہنستے ہیں حالانکہ آپکو قلق آنا چاہیئے اس غریب کی حالت پر جسے روشنی سے اتنی سچی محبت ہے کہ ڈوبتے چاند کی ٹھنڈی پھیکی کرنیں اور چڑھتے سورج کی گرم تیز شعاعیں یکساں عزیز ہیں۔ دونوں کی چھوٹ نے ملکر یہ گنگا جمنی رنگ پیدا کردیا ہے جسے آپ دو رنگی کہتے ہیں۔

۲

(۸ راگست ۱۹۴۷ء)

بھائی صاحب کا نام ان کے دوستوں اور عزیزوں میں بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ شاید ان کی بیوی کے سوا سب ہی لوگ انھیں بھائی صاحب کہہ کر پکارتے ہیں۔ سچ مچ وہ اپنی طرف سے ہر ایک کے ساتھ بھائی کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ اس کے گھر کو اپنا گھر، اس کے حقہ کو اپنا حقہ سمجھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کسر نفسی کی وجہ سے دوسروں کو موقع نہیں دیتے کہ وہ بھی ان کے ساتھ اس قسم کا برادرانہ برتاؤ کریں۔

شام کو میرے ہاں اکثر دوستوں کا مجمع ہوتا ہے۔ بھائی صاحب بھی عموماً آبراجتے ہیں۔ خصوصاً ان دنوں جب لکھنؤ سے خمیرے کا پارسل آیا ہوا ہو۔ کوئی ایسی ہی مجبوری ہو تو دو ایک چلم کے بعد اُٹھ جاتے ہیں۔ ورنہ چلموں بیٹھے رہتے ہیں۔ ایک کان سے سُنائی نہیں دیتا۔ دوسرے سے بھی کئی منزل اونچا سُنتے ہیں۔ ہم لوگ ان سے کہتے ہیں۔" بھائی صاحب کیا بات ہے آپ کے انصاف کی۔ سب کی ایک کان سے سُنتے ہیں (آہستہ سے) اور دوسرے کان سے اُڑا دیتے ہیں۔" دراصل سننے کا موقع بہت کم آتا ہے۔ زیادہ تر سناتے ہی رہتے ہیں۔ کسی نے کوئی بات چھیڑی اور انھوں نے اسے زبردستی اپنے ڈھب پر لاکر اپنا کھڑاگ چھیڑ دیا۔ بس ایک موضوع سے گھبراتے ہیں اور وہ سیاست ہے۔ جہاں سیاسی گفتگو شروع ہوئی اور وہ حقّہ لے کر الگ جا بیٹھے۔ کچھ دیر تک کہیں کہیں سے دو چار لفظ جو کان میں پڑ جائیں سنتے رہتے ہیں، تاؤ کھاتے رہتے ہیں اور زور زور سے حقّے کے کش لیتے رہتے ہیں۔ پھر سلگتے سلگتے ایک دم بھڑک اُٹھتے ہیں اور بحث کے بیچ میں اس طرح دھم سے کود پڑتے ہیں کہ سب دھک سے رہ جاتے ہیں۔ وہ پیچیدہ مسئلے جو بڑے بڑے مدبّروں کے ناخنِ تدبیر سے برسوں میں حل نہ ہوں۔ انکی گرمئی تقریر سے دم بھر میں پگھل جاتے ہیں۔

کل کا ذکر ہے ہم لوگ اس پر بحث کر رہے تھے کہ اگر تیسری عالمگیر جنگ چھڑ جائے تو ہندوستان کو امرطانیہ (امریکہ۔ برطانیہ) کا ساتھ دینا چاہئے یا روس کا، یا غیر جانبدار رہنا چاہئے۔ بحث کا ایک تکونا بن گیا!

اسے سیدھی لکیر بنانے کی کوشش کسی طرح کامیاب نہ ہوتی تھی۔ بھائی صاحب نے ایک ہی جھٹکے میں اسے اور ہم سب کو گھن چکر بنا دیا۔ ڈپٹ کر بولے "کیا بے کار کی رار مچا رکھی ہے۔ کچھ جانیں نہ بوجھیں بحث کرنے کو موجود۔ بھلا بتاؤ ہیروشیما میں جو ایٹم بم پھٹا تھا وہ کہاں سے آیا تھا۔ کہہ دو امریکہ سے۔ جی کہیں آیا نہ ہو۔ بھلا یہ بات عقل میں آتی ہے کہ امریکہ کے پاس ایٹم بم ہوتا اور وہ جرمنی پر فتح پانے کے لئے اپنی فوجیں کٹواتا۔ بم سے کام نہ لیتا۔ آج ہم سے سُن لو، یہ بم اندر سے پھٹا تھا اندر سے۔ یہ اسی مادے سے بنا تھا جس سے ٹوجو ہٹلر، مسولینی بنے تھے۔ یہی ایٹم بم آج امریکہ میں اور روس میں بن رہا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کل انگلستان یا ہندوستان میں نہیں بنے گا۔ بین الاقوامی حکمتِ عملی کو گُل حکمت کر کے چولھے میں ڈالو۔ اپنے ملک کے اندر، خود اپنے اندر ان چنگاریوں کو ڈھونڈو اور بجھاؤ جن سے ایٹم بم تیار ہوتا ہے۔ (حقّے کا کش لے کر) لاحول ولا قوۃ جل کر رہ گیا کیسا اچھا آرہا تھا۔"

۳

یکم ستمبر ۱۹۴۸ء

نعیم صاحب اور ان کی وکالت میں ان بن تو رہتی ہی تھی، سنہ ۱۹۲۰ء کی سیاسی تحریکات میں موقع دیکھ کر اسے طلاق دے بیٹھے۔ خدا کے فضل و کرم سے معاش سے آزاد تھے۔ جس کا بھائی محکمہ تعمیرات میں انجینئر ہو وہ آرام سے

گھر بیٹھ کر، سونے کا نوالہ کھا سکتا ہے اس لئے کہ انجنیری تو کیمیا کا نسخہ ہے، مٹی سے سونا بنانا اور جگہ استعارہ ہو مگر تعمیرات میں حقیقت ہے۔ ریت سے، سیمنٹ سے، اینٹوں سے، لوہے سے ہر چیز سے کھراکندن بنتا ہے۔

وکالت چھوڑکر نعیم صاحب نے سیاست میں قدم رکھا مگر منڈیر ہی کے اُستاد رہے، اکھاڑے میں نہیں اُترے۔ ان کے گھر پہ شام کو کانگریس اور خلافت کے پٹھے جمع ہوتے تھے۔ نعیم صاحب ان کو اندرونی اور بیرونی سیاست کے داؤں پیچ سمجھاتے اور اس کے بعد لیٹن کا دور چلتا۔ پہلے دھواں دھار تقریر اور پھر گرما گرم چائے۔ لوگ صبر کی تلخی کو، برفیریا کے لالچ میں برداشت کرتے تھے۔

نعیم صاحب کے ولی نعمت اور بھائی انجنیر صاحب پنشن پانے کے ہول سے وفات پا گئے۔ اور وصیت نامے میں بیوی بچوں کے نام جائداد اور نعیم صاحب کے نام دعائے خیر لکھ گئے۔ اس صدمے سے نعیم صاحب کا دماغ اُلٹ گیا۔ بہت دن تک مرے ہوئے بھائی کو کوستے رہے کہ اتنی جلدی کیوں مر گئے۔ سیاست بگھارنے کا شوق اب بھی باقی تھا مگر بگھارنے کا سامان نہیں رہا۔ اپنے ہاں چائے پلاکر چہکنے میں جو شان تھی وہ دوسروں کے ہاں پی کر بہکنے میں نہ تھی۔ مگر ان کو اس کا احساس نہ تھا بلکہ جوں جوں ان کی مالی حالت ابتر ہوتی گئی۔ اس کی تلافی کے لئے سیاست دانی کا ادعا بڑھتا گیا۔ رفتہ رفتہ تخیل کے زور سے فکر اور عمل کا فصل مٹ گیا۔ اب بچارے پر سیاست کی نظری باریکیاں سمجھانے ہی کا نہیں بلکہ ان کی عملی گتھیاں سلجھانے کا بار بھی پڑ گیا اور اس کو یہ ناتواں اُٹھائے پھرتا ہے

فرماتے ہیں" یہ ٹرومین تو ٹائیں ٹائیں فش ہو کر رہ گیا۔ اب دیکھیں ڈیوی کیا کرتا ہے
ہماری رائے میں تو چرچل کو چاہیئے کہ امریکی شہری بن کر صدر منتخب ہو جائے۔ امریکہ
والوں کو آج کل ایسے ہی قابوچی کی ضرورت ہے اور چین اور جرمنی کے یہ جھگڑے
تو محض بے کار ہیں۔ کوئی ان کو سمجھائے کہ میاں دو قوموں کا نظریہ مان لو، دو
دو حصوں میں بٹ کر برطانوی ڈومینیں بن جاؤ۔ گورنر جنرلوں کی ضرورت ہو تو
ہندوستان سے منگوا لینا۔ رہا فلسطین تو وہاں نئی ریاست کا بادشاہ قاؤقجی فوزی
کو بنا دو۔ اپنے آپ کو عرب نسل سے بتاتا ہے۔ صورت سے یہودی معلوم ہوتا
ہے۔ دونوں خوش ہو جائیں گے اور ضمناً حیدرآباد کا مسئلہ بھی حل ہو جائے
گا۔ چین کا قصہ برسوں سے چل رہا ہے۔ کسی طرح طے ہونے میں نہیں آتا۔ اس
کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ جاپان پوست کی کاشت کرے، اس کی معاشی
مشکل آسان ہو جائے گی اور چین کو افیون بھیجی جائے، اس کی سیاسی گتھی سلجھ
جائے گی۔ افیم کے عمل سے چینیوں میں پھر وہی دھیان، گیان، رقت قلب اور
صلح جوئی پیدا ہو جائے گی اور اس روز روز کی خانہ جنگی سے چھٹکارا مل جائے
گا۔ اور یہ کشمیر کا جھگڑا بھی کوئی جھگڑا ہے۔ وہ تو اسی دن طے ہو گیا تھا جس دن مہاراجہ
نے "مایۂ خویش" باہر کے بنکوں میں منتقل کر کے ریاست کا حساب کتاب شیخ عبداللہ
کے سپرد کر دیا اور اب جو ہندوستان اور پاکستان کی میزان نہیں بیٹھتی۔ اس کی
تدبیر ہم سے پوچھو۔ پنڈت نہرو تو کر لیں شادی اور لیاقت علی تجرد کی زندگی اختیار
کریں، تیل، مرچ، کھٹائی، بادی چیزوں کا پرہیز رکھیں۔ پھر اگر ہماری سیاست
اعتدال پر نہ آ جائے۔ تو نعیم کا نام بدل دینا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ سب کرے کون

لے دے کر ایک نعیم کم بخت اکیلا کس کس چیز کو سنبھالے۔ ایک دل ہزار فکریں ایک سر ہزار سودا۔"

۴

۸ر اکتوبر ۱۹۴۶ء

ہمارے دوست ل، ک، ملاحی صاحب دیکھنے میں تو بڑے حلیم الطبع اور رقیق القلب نظر آتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ دائمی نزلے نے ان کی آواز میں ایک جکڑی سی ہوئی نرمی اور چہرے پر ایک بہتی ہوئی رقت کی کیفیت پیدا کر رکھی ہے۔ لیکن اگر کبھی غصہ آجائے تو الامان، الحفیظ۔ یہی رقت اس طرح تپنے اور دہکنے لگتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے جوالا مکھی کے دہانے سے لاوا اُبل رہا ہے۔ لوگ جتنا ان کے فرطِ غضب سے ڈرتے ہیں، اتنے ہی ان کے وفورِ محبت سے بھی خائف رہتے ہیں اس لئے کہ دونوں حالتوں میں صرف پاسبانِ عقل ہی نہیں بلکہ پاسبانِ ادب بھی اس بگڑے دل کو تنہا چھوڑ کر ٹہل جاتا ہے اور اس کی زبان سے بے ساختہ اردوئے معلّے کے چھٹے ہوئے محاورے سرزد ہونے لگتے ہیں۔ جن میں عموماً مخاطب کی خلافِ شرع پیدائش کا ذکر ہوتا ہے اور اس کے خاندان کے ساتھ سسرالی رشتوں کا اور طرح طرح کے ازدواجی اور غیر ازدواجی تعلقات کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ ملاحی صاحب کو اپنے صاف دل ہونے پر بڑا فخر ہے اور یہ اس لحاظ سے صحیح ہے کہ گو ان کے دل میں گندگی بڑی کثرت

سے پیدا ہوتی ہے پر ٹھہرنے نہیں پاتی، فوراً اگل پڑتی ہے اور دل بنی ہوئی اوجھڑی کی طرح صاف ہوجاتا ہے۔ مگر ان کو یہ شکایت ہے کہ ان کا دل صاف ہوتے ہی دوسروں کا دل میلا ہو جاتا ہے۔ سخت افسوس کیا کرتے ہیں کہ اس انگریزی تہذیب نے ہمارے مذاق اور اخلاق کا ہاضمہ خراب کر دیا ہے۔ ان کو کوئی چٹ پٹی مسالہ دار چیز پچتی ہی نہیں ہے۔ موجودہ عہد کے اخلاقی ضعف معدہ پر ملامت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آخر ہمارے بزرگ بھی تو تھے جو میر ضاحک اور سودا کی ہجویں، جعفر زٹلی کی ہزل، رنگین اور جان صاحب کی ریختی، شوق کی مثنویاں، یہاں تک کہ چرکین کی اسہالیات ہضم کر جاتے تھے اور ڈکار نہ لیتے تھے۔ ہمارے نئے ادب کی عریانیات میں ملا جی صاحب کو خاک مزہ نہیں آتا۔ وہ تو اس اکسیر کے قائل ہیں جس سے مرادآباد میں مردہ زندہ ہو جائے۔ جب آج کل کی کسی تصنیف نہانی کا ذکر سنتے ہیں تو بڑے شوق سے منگوا کر پڑھتے ہیں اور مایوس ہو کر کہتے ہیں، "واہ بس دیکھ لیا" اس برتے پر تتا پانی "!

۵

۸ دسمبر ۱۹۴۵ء

ع   اپنے سے کر، نہ غیر سے، الفت ہی کیوں نہ ہو

معلوم نہیں غالب مرحوم کو یہ نصیحت کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس لئے کہ یہی تو ایک فرض ہے جسے عام طور پر لوگ آپ ہی آپ

بڑے ذوق شوق سے ادا کرتے ہیں۔ اگر کچھ خدا کے بندے ایسے ہوں بھی۔
جنھیں اس بارے میں تاکید کی ضرورت ہو تو ہمارے نہال صاحب ان میں
سے نہیں ہیں۔ نہال صاحب کو اپنے آپ سے سچی اور گہری محبت ہے۔ وہ اپنی
صورت کے عاشق زار ہیں۔ مگر غیرت مند خوددار عاشقوں کی طرح اپنا
راز محبت دوسروں پر ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ چھپ چھپ کر آئینے میں
اپنی شکل دیکھتے ہیں اور عش عش کرتے ہیں۔ دوسروں کی کوتاہ بیں نظر کو
ان کے چوکور چہرے، چوکھی رنگت، فراخ دہانے، کشادہ، ہوادار، ناک
اور بانکی ترچھی آنکھوں میں کوئی حسن دکھائی نہیں دیتا۔ مگر لیلےٰ را بہ چشم مجنوں
باید دید۔ نہال صاحب کو آئینے میں انسان کا عکس نہیں بلکہ حسن و جمال کی
پوٹ نظر آتی ہے۔ جسے دیکھ کر ان کا دل لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔

نہال صاحب کے کان بڑے حساس ہیں۔ ہر آواز جو ذرا سی سخت
یا کرخت، تیز یا بھاری پھٹی ہوئی یا بیٹھی ہوئی ہو اُن کو زہر لگتی ہے۔ مگر اپنی آواز
کا زیر و بم، شدّ و مد، قبض و بسط انھیں اتنا پسند ہے کہ ہر وقت منہ ہی منہ میں
گنگناتے رہتے ہیں اور دل ہی دل میں مزے لیتے رہتے ہیں۔ اور جہاں موقع
رنگ روپ اور سر تال ہی پر موقوف نہیں، وہ اپنی آن بان سج دھج
چال ڈھال، غرض ایک ایک ادا پر سو سو جان سے قربان ہیں۔ مگر یہ نہ سمجھئے گا
کہ نہال صاحب محض صورت کے بندے ہیں۔ وہ اپنے جمال ظاہری
سے کہیں زیادہ اپنے حسن باطنی کی قدر کرتے ہیں۔ ان کی جوہر شناس آنکھ
اپنی سیرت میں ایسی ایسی خوبیاں دیکھتی ہے جنھیں غیر کی نظریں مشکل سے پرکھ

سکتی ہیں۔ مثلاً ان کا اپنے ساتھ حسنِ سلوک، اپنی ہمدردی، دل نوازی، دلداری دلجوئی، اپنے عیبوں سے چشم پوشی، اپنی خطاؤں سے درگذر، ہر مصیبت میں اپنا ساتھ دینا۔ ہر مشکل میں اپنے کام آنا۔ ان صفات حسنہ کی وجہ سے اپنی پرستش اس خشوع وخضوع کے ساتھ کرتے ہیں کہ بالکل ع

صنم ہم، دیر ہم، بت خانہ ہم، بت ہم، برہمن ہم

کے مصداق بن کر رہ گئے۔

نہال صاحب کے عشق مجہول کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کسی کو ان سے رقابت نہیں، وہ بلا شرکت غیرے اپنے محبوب کے لطف وکرم سے بہرہ اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی اکتا کر یہ کہہ اٹھتے ہیں۔

ع کاش کوئی رقیب بھی ہوتا

۶

۱۶ر اپریل ۱۹۴۹ء

معلوم نہیں ہمارے دوست ش، ک، م کو قدرت نے اور حواس عطا کئے ہیں یا نہیں۔ مگر اس کی ہم گواہی دے سکتے ہیں کہ دو قوتیں ان کو پیٹ بھر کر ملی ہیں، شامہ اور ذائقہ۔ سونگھنے کی قوت بلا کی تیز ہے اور شاید اس کی وجہ سے لوگ "انھیں سارے شہر کی ناک" کہتے ہیں۔ کوسوں کے گردے میں

کہیں پکوان پکنا یا مسالہ بھننا شروع ہوا اور ان کے نتھنے پھڑکے۔ اب رہی چکھنے کی قوت سو وہ سارے حواس پر اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ وہ کھانے کا مزہ ہی نہیں چکھتے بلکہ خوشبو، رنگ، قوام بھی چکھتے ہیں۔ اس کا خستہ پن بھربھراپن، کراراپن بھی چکھتے ہیں۔

مگر ایک مشکل یہ ہے کہ ہنڈیا ڈوئی کی مالک گھروالی ذرا "کنٹک" واقع ہوئی ہے اس لئے ہمارے دوست کے اپنے گھر میں ع

بہ قدر شوق نہیں ظرف تنگ نائے غزا

مگر اس کی تلافی کے طور پر قدرت نے انھیں دو ظاہری حسوں کے علاوہ ایک باطنی حس عطا کی ہے جس کا اب تک کوئی نام نہیں۔ آپ کشفِ باطنی کے قیاس پر "کشفِ بطنی" یا "پیٹ کی بُوجھ" کہہ لیجئے۔ کسی عزیز و قریب دوست، جان پہچان والے کے ہاں دعوت ہو اور لاکھ اہتمام کیا جائے کہ ش۔ک۔م کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ عین وقت پر ان کے "اک ہوک سی دل میں" (یا پیٹ میں؟) اٹھتی ہے، ان کی طبیعت اس شخص کو جس کے ہاں دعوت ہے دیکھنے کو بے چین ہو جاتی ہے۔ طرح طرح کے وہم آنے لگتے ہیں کہ نہ جانے بے چارے کا کیا حال ہے اور وہ بے خودی کے عالم میں موٹر میں صرف اتنا پٹرول ڈال کر کہ منزل مقصود پر پہنچ کر ختم ہو جائے اور واپسی کے لئے صاحبِ خانہ کو دینا پڑے، روانہ ہو جاتے ہیں۔ وہاں پہنچکر دیکھتے ہیں کہ سب خیریت ہے بلکہ کچھ اس سے بھی بڑھ کر۔ نہ پوچھئے کہ خوشی کے مارے ہمارے دوست

کا کیا حال ہوتا ہے۔ صاحب خانہ جھوٹوں کہہ دے کہ چلئے کھانا کھا لیجئے تو وہ فوراً مان جاتے ہیں بلکہ بے کہے بھی مان لیتے ہیں اور ہاتھ دھو کر جُٹ جاتے ہیں۔

اب ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کا چمکنا، لمبے لمبے ہاتھوں کا جلاہے کی راچھ کی طرح جلدی جلدی چلنا، کشادہ نتھنوں سے رقت کے سیلاب کا بہنا تنگ ماتھے پر محنت کے پسینے کا جھلکنا وہ منظر ہے جس کی تصویر

ع۔ پائے طاؤس پئے خامہ مانی مانگے

۷

۲۴ را پریل ۱۹۴۹ء

تمھارے صاحب کا نام مجھے کیا کسی کو بھی معلوم نہیں۔ گاؤں بھر انھیں "تمھارے صاحب" ہی کہتا ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ لوگوں کو "تمہارے صاحب" کہہ کر مخاطب کیا کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے اسے بات کی ٹیکن بنالیا ہے۔ جہاں زبان رُکی اور انھوں نے اسی کا سہارا لیا۔ اس لئے ان کا یہی نام پڑ گیا۔ ہاں جی چاہے تو ان کا تھوڑا سا حلیہ سُن لیجئے۔ تھوڑا سا اس لئے نہیں کہ مجھے اختصار منظور ہے بلکہ ان کا حلیہ ہے ہی ذرا سا۔ ٹھنگنا قد اکہرا بدن۔ دبلا چہرہ، سانولا رنگ، خشخشی داڑھی، سر پہ پٹے۔ اللہ اللہ خیر سلّا۔ کپڑے بھی واجبی ہی پہنتے۔ نیچا کرتہ، اونچا پاجامہ یا کبھی لنگی، سر پہ رومال

پٹا ہوا۔ آنکھوں میں سرمہ روز لگاتے ہیں۔ سر میں تیل چوتھے دن ڈالا کرتے ہیں
"تمھارے صاحب" ایک چھوٹے سے زمیندار تھے۔ قریب کے کسی
گاؤں میں ان کی دو ڈھائی سو بیگھے زمین تھی جو مقدمہ بازی میں ٹھکانے
لگ گئی۔ اس وقت سے وہ ہمارے گھر میں کچھ عزیز اور کچھ نوکر کی طرح
رہتے ہیں۔ کام وہ صرف دو ہی کرتے ہیں۔ ایک تو گھر کے بڑے بوڑھوں
کو حقہ بھر کر پلانا، دوسرا بازار سے سودا سلف لانا۔ سودا چکانے میں ان کی
انوکھی عادت ہے کہ ہمیشہ دوکان دار کی سی کہتے ہیں۔ مثلاً خربوزے والا آیا
ہے اور زنانی ڈیوڑھی پہ اس سے بھاؤ چکایا جا رہا ہے۔ یہ حضرت بھی موجود
ہیں۔ بیچنے والا سیر کے چار آنے مانگ رہا ہے۔ خریدنے والے دو آنے کہہ
کہہ رہے ہیں۔ ان حضرت کا فیصلہ یہ ہوتا ہے۔ "نہیں تمھارے صاحب
یہ خربوزے تو چار ہی آنے سیر کے ہیں۔" اور جو کسی نے کہا کہ تم بیچ میں کیوں
بولتے ہو، تو بھولے پن سے فرماتے ہیں "تمہارے صاحب وہ تو آپ
ہی چار آنے سیر کہہ رہا ہے ہم نے کہا تو کیا برا کیا۔"

ان کی سادگی کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ آپس کے رشتے ان کی
سمجھ میں نہیں آتے۔ پھپھی کی خلیا ساس کو نانی اور بیوی کے بہنوئی کو نندوئی
غرض اسی طرح اٹکل پچو رشتے بتا دیا کرتے ہیں۔

گھر کے سب بچے ان کے پیچھے پڑ کر طرح طرح کے سوال پوچھتے ہیں
اور ان کے جواب سن کر ہنستے ہنستے لوٹ جاتے ہیں۔ ایک بار اُن سے
پوچھا کہ فلاں درزی کے سگے دادا کی سگی پوتی اس کی کون ہوئی۔ پہلے تو

انھوں نے اس درزی کے دادا کا نام ولدیت، سکونت، عمر کی تحقیق کی. پھر اس کی پوتی کا نام اور عمر پوچھی. یہ سب چھان بین کرنے کے بعد فرماتے ہیں "بھئی کسی کے گھر کا حال ہمیں کیا معلوم، اسی سے پوچھ لو"

شادی انھوں نے کم عمری کے زمانے میں کرلی تھی. بیوی تعداد میں ایک ہیں. مگر مقدار میں اُن سے چوگنی اور پھر تیز مزاج ہے. اس لئے یہ ان سے بہت ڈرتے ہیں. بال بچے ہیں نہیں اور بیوی سے محبت کرنے کی ہمّت نہیں پڑتی تھی. اس لئے محبت کا جذبہ ادھر جانوروں کی طرف منتقل ہوگیا ہے. بکریاں، مرغے، طوطے، مینا، بٹیر غرض بیسیوں جانور پال رکھے ہیں اور ان سے بہت مانوس ہیں. کسی حکیم کا قول ہے اور نہیں ہے تو ہونا چاہئے کہ انسان کو جس جانور سے زیادہ سابقہ رہے اس کی روحِ حیوانی اسی جانور کا رنگ اختیار کرلیتی ہے. اس لحاظ سے دیکھئے تو "تمہارے صاحب" کی روحِ ایک پورے چڑیا خانے سے کم نہ ہوگی

۸

۱۹ر جنوری سنہ ۱۹۵۰ء

ہمارے خطیب صاحب باتیں کرنے کے قائل نہیں. خلوت و جلوت میں، مستی و ہوشیاری میں، خواب و بیداری میں ہمیشہ تقریر فرماتے رہتے ہیں. بات اور تقریر میں جو فرق ہے وہ آپ اچھی جانتے ہوں گے اور اگر

نہ جانتے ہوں تو کسی پاکستانی قائد یا ہندوستانی نیتا کے پاس چلے جائیے اور کہیئے "منہ سے مجھے بتا کہ یوں"۔ مختصر یہ کہ بات کی جاتی ہے، تقریر جھاڑی جاتی ہے۔ بات کا سر پیر ہوتا ہے، تقریر کا نہ سر ہوتا ہے نہ پیر، بس دھڑ سے لڑھکتی چلی جاتی ہے۔ بات میں سے بات نکلتی ہے۔ تقریر میں سے کچھ بھی نہیں نکلتا بات اپنے پیٹ میں نہیں پچتی، تقریر دوسرے کو ہضم نہیں ہوتی۔

آپ لاکھ چاہیں کہ خطیب صاحب کو تقریر کا موقع نہ دیں، ایسا موضوع چھیڑ دیں جس میں پھیلنے کی گنجائش نہ ہو، مگر وہ پھیل ہی پڑتے ہیں۔ آپ کی خطیب صاحب سے پہلی ملاقات ہو اور آپ انجان بنکر پوچھیں "آپ کا اسم شریف؟" کوئی دوسرا ہو تو اپنا نام اور ولدیت یا زیادہ سے زیادہ ولدیت کی ولدیت بتا کر بس کرے مگر ہمارے خطیب صاحب فرمائیں گے "جی کیا عرض کروں عرف میں تو میں خطیب کہلاتا ہوں مگر یہ والدین کا رکھا ہوا نام نہیں۔ مادر علمی کا بخشا ہوا لقب ہے، وہاں عجیب دستور ہے کہ لوگوں کو خصوصاً دلچسپ لوگوں کو ان کے اصلی نام سے نہیں پکارتے، بلکہ کسی صفت کی بنا پر جو اس میں واقعی موجود ہو یا خواہ مخواہ اس کی طرف منسوب کی جاتی ہو، اس کو ایک لقب سے ملقب کر دیتے ہیں اور ہمیشہ اسی لقب سے پکارتے ہیں۔ اصلی نام قلت استعمال سے متروک اور رفتہ رفتہ معدوم ہو جاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ امر کہاں تک مناسب ہے۔ آخر نام رکھنے کی علت غائی کیا ہے ...." آپ کو قہر درویش بجان درویش ساری تقریر سننی پڑتی ہے بلکہ جب مقرر سے آنکھیں چار ہو جائیں تو سنجیدگی سے سر بھی ہلانا پڑتا ہے

جب خطیب صاحب کا پہلا خطبہ سر ہو چکتا ہے تو آپ ڈرتے ڈرتے دوسرا سوال کرتے ہیں "دولت خانہ" بظاہر اس کا جواب کسی طرح ایک خانے سے زیادہ نہیں ہو سکتا، مگر خطیب صاحب پوری بساط کھول دیتے ہیں" ارے صاحب آپ نے بھی کیا بات پوچھی ؎

گھر بار سے کیا فقیر کو کام
کیا لیجئے چھوڑے گاؤں کا نام

دراصل میرے بزرگ اکبر اعظم کے زمانے میں حکیم ابوالفتح شیرازی کی تحریک پر نیشاپور سے ترک وطن کرکے ہندوستان روانہ ہوئے ......"
آپ کا دم سوکھ جاتا ہے کہ الٰہی خیر خدا جانے مبتدا سے خبر تک کن کن منزلوں سے گذرنا پڑے۔ جب خطیب صاحب نیشاپور سے آگرہ کی مسافت زمانی اور اکبر اعظم کے عہد سے قاسم رضوی کے عہد کا فصل زمانی طے کرکے اپنے موجودہ وطن تک پہنچتے ہیں تو آپ میں کوئی اور سوال کرنے کی ہمت باقی نہیں رہتی اور آپ حیدرآباد والوں کی طرح "حاضر ہوتا ہوں" کہہ کر غائب ہو جاتے ہیں۔

مگر یہ تو سوچئے کہ خطیب صاحب کا خطبۂ نکاح جب پڑھا یا گیا ہوگا اور قاضی نے ان سے پوچھا ہوگا "مسماۃ فلاں بنت فلاں کو بہ عوض مہر معلوم آپ کے حبالۂ نکاح میں دیا جاتا ہے۔ آپ کو منظور ہے؟" تو بیچارے خطیب صاحب پہ کیا گذری ہوگی!

۹

۲۴ رجنوری سنہ ۱۹۵۰ء

لال بجھکڑ کو تو سنا ہی سنا تھا، چودھری جنڈیل کو آنکھوں سے دیکھ لیا۔ جنڈیل تو ظاہر ہے جرنیل کی خرابی ہے اور چودھری محض نیت کا فتور ہے۔ اس لئے کہ وہ دراصل ذات کے جلاہے ہیں اور نام کے بہادر ہیں۔ ان کی پیدایش کا سن مشتبہ ہے لیکن پیدائش یقینی ہے۔ تعلیم صفر تو نہیں مگر ایک چھوٹی سی کسر کہہ سکتے ہیں اور اس میں بھی شیخ بہادر کا کوئی قصور نہیں تھا، بچارے بچپن میں تین چار برس اپنے چچا کے ساتھ شہر میں رہے۔ وہاں جبری تعلیم میں گرفتار ہو گئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں جب کرنیل جوان اور اڑیل ٹٹو لام پر بھیجے جا رہے تھے۔ یہ بھی مہاجن کے سود اور بیوی کے اصل مع سود سے جان چھڑانے کے لئے فوج میں بھرتی ہو کر فرانس چلے گئے۔ وہاں اور تو سب چیزیں انھیں پسند آئیں، مگر جرمنوں کی یہ حرکت بہت ناگوار ہوئی کہ وہ سترہ اینچ کے دہانوں کی توپوں سے گولے برساتے تھے رائفل کی گولیوں تک تو خیر۔ ع

برسر اولادِ آدم ہرچہ آید بگذرد

کا معاملہ تھا، یعنی وہ خندق میں چھپے ہوئے سپاہیوں کے سروں پر سے گذرتی چلی جاتی تھیں۔ مگر یہ کم بخت توپ کے گولے تو میدان کو خندق اور خندق کو میدان بنا دیتے تھے۔ چودھری بڑے رقیق القلب

آدمی تھے۔ انھیں اپنے اوپر بڑا قلق آیا کہ ہائے یہ تو وہی قصہ ہوا کہ کرگھا
چھوڑ تماشے جائے، ناحق چوٹ جلاہا کھائے۔ اگر کوئی گولا ادھر آن پڑا
تو ہم بچارے مفت ہیں مارے گئے۔ دراصل وہ بچارے لہو لگا کر شہیدوں
میں داخل ہونے آئے تھے۔ مگر یہاں اس کا ڈول نظر نہیں آیا۔ اس لئے
انھوں نے یہ ترکیب کی کہ لہو بہا کے شہیدوں سے خارج ہو گئے۔ یعنی
ایک دن موقع پا کے چاقو سے اپنے داہنے ہاتھ کی کلمے کی انگلی کاٹ
ڈالی اور "ان فٹ" ہونے کی وجہ سے "ڈس چارج" کر دیئے گئے۔ مگر
لام سے لوٹ کر انھوں نے اپنے جنگی کارناموں کا ایسا لام باندھا کہ نہ
صرف ہمارے گاؤں میں بلکہ آس پاس کے دیہات میں چودھری جنڈیل
کے نام سے مشہور ہو گئے۔ فرانس جانے سے پہلے انھوں نے اپنی کرگھا
ہمسائے کو سونپ دی تھی اور کھیت بٹائی پر دے دیئے تھے۔ وہی
انتظام اب بھی قائم رکھا۔ اس لئے کہ بہ نفس نفیس بنائی یا کھیتی کا کام کرنے
سے ان کی شان جنڈیلی میں فرق آتا تھا۔ اب ان کا عام شغل ہر قسم کے
علمی اور عملی مسائل کا تانا بانا ملانا اور خاص شغل مقامی، ملکی اور بین الاقوامی
سیاست کی زمین میں ہل چلانا تھا۔ قریب قریب روزانہ شام سے رات گئے
تک گاؤں کی چوپال میں ان کی پریس کانفرنس ہوا کرتی تھی۔ جس میں وہ
تہ بازاری سے لے کر چور بازاری تک، اور زمینداری کے خاتمے سے لیکر
دنیا کے خاتمے تک ہر قسم کے دلچسپ مسئلوں کو حل کیا کرتے تھے۔
اس سیاق و سباق کے ساتھ اب چودھری جنڈیل کی ایک پریس

کانفرنس کا حال سنئے۔

۲۵ رجنوری ۱۹۵۶ء کا دن گذرنے کے بعد شام کو حسب معمول چودھری صاحب چلم سے لو لگائے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ آج مجلس میں غیر معمولی چہل پہل تھی اور سب کی زبان پر "اجادی دن" کا چرچا تھا جو صبح کو زور شور سے منایا جانے والا تھا۔ اتنے میں نمبردار کے لڑکے نے جو شہر میں ہائی اسکول میں پڑھتا تھا اور چھٹی پر گھر آیا ہوا تھا کسی سے کہا "کل معمولی آزادی کا دن تھوڑی ہے جو ہر سال ہوا کرتا تھا، کل تو جمہوریت کا دن ہے۔" لوگ لڑکے کی طرف متوجہ ہوئے تو چودھری گھبرائے کہ لو یہ تو ہمارا ایک حریف پیدا ہو گیا، جھٹ سے بول اُٹھے: "سچ کہتا ہے بچہ۔ اللہ اس کی عمر میں برکت دے۔ بڑا جہین مالم دیتا ہے۔ ہاں بیٹا کل جموریت کا دن ہے، آؤ تمہیں جموریت کا حال بتائیں۔ ہم تو پھرانس میں اور بلایت میں اپنی آنکھ سے دیکھ آئے ہیں۔ پھرانس میں بڑی کھبسورت اور سستی ہوتی ہے مگر جرا نازک ہے ہاتھ لگانے سے ٹوٹتی ہے۔ بلایت کا مال موٹا اور مہنگا سہی پر ہے بڑا مجبوت۔ ہتھوڑے سے بھی توڑنا چاہو تو لچک بھلے جائے پر ٹوٹنے کا نہیں۔

جرمن اور پھرانس میں جموریت ہی کی تو ساری لڑائی تھی ہوا یہ کہ پھرانس کی جموریت کو دیکھ کر جرمن کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ان نے کہا میں تو اسے چھین کر رہوں گا۔ سچ مچ وہ ایسا تگڑا جوان تھا کہ پھرانس بچارا بوڑھا اس کے آگے کیا ٹھہر سکتا تھا۔ انگریج، امریکہ، روس سب نے سوچا کہ یہ تو بری بات

ہے آج پھرانس کی جمورت چھن گئی تو کل ہماری چھن جائے گی۔ بس بھیا سب مل کر جرمن پہ پل پڑے اور مارتے مارتے بھرکس نکال دیا۔ مگر وہ پٹھا ایسا لاگو کہ بیس اکیس برس پیچھے ہٹلر کا بھیس بنا پھر آن دھمکا۔ اور اب کی بار تو بچارے پھرانس کو دبوچ کر بیٹھ گیا۔ پھر اللہ تمہارا بھلا کرے اسی انگریج، امریکا اور روس کے ٹنگڑم نے ملکر بڑی مشکلوں سے جمورت کو چھڑایا تو یہ جمورت ایسی چیز ہے کہ سب کی اس پہ رال ٹپکتی ہے۔ یہ جو کانگریس اور انگریج کی برسوں سے لڑائی چھڑ رہی تھی نا سو اسی جمورت کے پیچھے۔ کانگریس کہتی تھی ہمیں جمورت منگا کر دو نہیں تو اپنا راستہ سنبھالو ہم اپنی آپ بنالیں گے۔ آخر کو وہی ہوا۔ انگریج چلا گیا اور کانگریس نے دلی میں ایک کارکھانا کھول جلدی جلدی اپنی دیسی جمورت گھڑ ڈالی۔ اسی کا دیس میں تہوار منایا جائے گا۔ ہمیں بھی ——————"

نمبردار کا لڑکا کچھ تمسخر کچھ حقارت کے انداز سے یہ لکچر سن رہا تھا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے بات کاٹ کر کہا "چودھری جی تم ساری رام کہانی سُنا گئے مگر یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں یہ کہ تمہاری "جمورت" ہے کیا چیز؟"

اب چودھری جنڈیل آئیں تو جائیں کہاں۔ برس ہی تو پڑے "ارے کم بکھت کوڑھ مگج تو نے اتنی انگریجی پڑھ ڈالی اور آج تک اتنا نہ مالم ہوا کہ جمورت کیا چیز ہے؟ نمبردار صاحب نے تجھے پڑھا کر بھی کھویا، چل دور ہو میرے سامنے سے!"

۱۰

۸ر فروری ۱۹۵۰ء

ہمارے مرزا صاحب کا مزاج ماشاء اللہ بچپن سے تیز ہے اور کیوں نہ ہو آخر کس باپ کے بیٹے ہیں اور کس ماں کے دلارے ہیں۔ والد مرحوم خدا بخشے اس دبدبے کے آدمی تھے کہ مکھی سارے بدن پر اور جہاں ہے جہاں بیٹھ جائے مگر ناک پر کبھی نہ بیٹھنے دیتے تھے اور والدہ مرحومہ خدا جنت نصیب کرے اس طنطنے کی بیوی تھیں کہ خود مرحوم بھی اپنے سارے دبدبے کے باوجود ان سے دب جاتے تھے۔ مرحوم کی جھنجھلاہٹ اور جھلاہٹ اور مرحومہ کی تریاہٹ مرزا صاحب کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اسی لیے گھٹی اتنی کڑوی ہوتی تھی کہ بڑی مشکل سے منہ چیر چیر کر پلائی جاتی تھی۔ مرزا کی بچپن کی ضدیں دیکھ کر شاعر کا ننھا معشوق یاد آ جاتا تھا جس کی شان میں اس نے بڑی ممتا سے کہا ہے۔

بچپنا ہے تو ضدیں بھی ہیں نرالی ان کی
اس پہ مچلے ہیں کہ ہم دردِ جگر دیکھیں گے

شاعر کے ننھے میاں کی نرالی ضدوں میں پھر بھی ایک ستم ظریفی اور شعریت کی شان تھی۔ مگر ہمارے مرزا کی باؤلی ضدوں کی تو کوئی تک ہی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ مثلاً اماں باوا کے ساتھ تانگے پر سوار ہوئے تو مچل گئے کہ میں گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھوں گا۔ باوا نے جو اگلی سیٹ پر

تانگے والے کے برابر بیٹھے ہوئے تھے بیٹے کی خوشی پوری کرنے کے لئے دونوں ہاتھوں سے بچہ گھوڑے کی دم کی طرف منہ کر کے بٹھا دیا۔ وہ گھبرایا کہ یہ کیا آفت آئی اور بھڑک کر پیچھے ہٹنے لگا۔ صاحب زادے کو یہ رجعت قہقری پسند آگئی اور حکم ہوا کہ تانگہ اُلٹا چلے۔ اب تانگہ ہے کہ "بیک" ہو رہا ہے۔ سڑک پر افراتفری مچی ہوئی ہے اور لوگ راکب و مرکب کی شان میں فی البدیہہ ہجو ملیح و قبیح کہہ کر سنا رہے ہیں۔

اگر مرزا کے والدین میں پیرزائی کم اور دانائی زیادہ ہوتی تو وہ کبھی دل میں سوچتے۔

دیکھئے لاتی ہے اس شوخ کی وحشت کیا رنگ
جس کی ہر بات پہ ہم نام خدا کہتے ہیں

لیکن وہ تو اپنے لختِ جگر کی اوندھی کھوپڑی کو جامِ جہاں نما سمجھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ ان کی نازبرداریوں سے ہمارے مرزا کی الٹی مت اور بگڑتی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اب وہ ابلقِ ایام پر اسی طرح دم کی طرف منہ کر کے سوار ہیں جیسے کبھی بچپن میں تانگے کے گھوڑے پر سوار ہوئے تھے اور چاہتے ہیں کہ زمانہ ان کے حکم سے اُلٹا چلے۔ مگر توبہ کیجئے زمانہ کوئی بھاڑے کا ٹٹو تھوڑا ہی ہے کہ کسی پیر نابالغ کسی ننھے بڑے میاں کے بہلانے کے لئے اپنی چال بدل دے۔ بہرحال اب مرزا صاحب کی یہ حالت ہے کہ دنیا سے خفا اور زندگی سے بیزار ہیں۔

ملک میں جتنی تبدیلیاں ہوئیں یا ہو رہی ہیں انھیں وہ سمجھتے ہیں [illegible]

یا حریف بے پیرے نے محض ان کے ستانے اور ذلیل کرنے کے لئے کی ہیں انگریز کا کوچ، کانگریس کا مقام، ہندوستان کی تقسیم، پنجاب کی ضرب، زمینداری کا قتل، چور بازاری کی بسم اللہ اوروں کے لئے خوش گوار یا ناخوش گوار تاریخی واقعات ہیں لیکن ہمارے مرزا صاحب کے لئے چرکے ہیں جو خاص ان کی ذات شریف کو لگائے جا رہے ہیں، کچوکے ہیں جو صرف ان کے نفس نفیس کو دیئے جا رہے ہیں۔ اس لئے وہ اس تسکین سے جو انسان مرگ انبوہ کو جشن سمجھ کر حاصل کرتا ہے محروم ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں تین طرح کے آدمی ہیں ایک وہ جو اشہب زمانہ کی موجودہ چال سے خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ بس "فروٹ" اڑتا چلا جائے دوسرے وہ جو اس کی باگوں کو داہنی طرف اور تیسرے وہ جو بائیں طرف موڑنا چاہتے ہیں۔ مگر ہمارے مرزا صاحب کا ڈھنگ سب سے الگ ہے۔ وہ دانت پیس پیس کر اسکی دم مروڑ رہے ہیں کہ الٹے پیروں پیچھے کی طرف بھاگے۔ اسی لئے جھٹکے پر جھٹکے کھا رہے ہیں اور ڈر یہ ہے کہ کہیں منہ کے بھل زمین پر نہ آ رہیں۔

۱۱

۸ رجون سنہ ۱۹۵۰ء

چچا سعدی جو یہ کہہ گئے۔

مسکین خر اگرچہ بے تمیز است چوں بار ہمی برد عزیز است

تو ہم جیسے سعادت مند بھتیجوں کے لئے بڑی مصیبت ہوگئی۔

بات یہ ہے کہ گلستاں ہمیں بچپن میں گویا گھٹی میں پلائی گئی تھی۔ یعنی اس عمر میں پڑھائی گئی تھی جب الف بے کی تختی لکھنا بھی اچھی طرح نہ آتا تھا۔ ہم اپنی سادہ لوحی سے آدب برائے ادب کی اس نورتن چٹنی کو ادب برائے زندگی کی دال روٹی سمجھ بیٹھے اور اس کے چٹکلوں سے لطف اٹھانے کے بجائے ان پر عمل کرنے لگے۔ چنانچہ جب سے ہمارے مکتب کے میاں جی نے جنھیں لوگ پیار سے "مولی مٹا" کہا کرتے تھے۔ ہمیں اوپر کا شعر پڑھایا اور اس کے معنی زبانِ حال اور زبانِ قال سے بتائے۔ ہم نے خرِ مسکین بننے اور بار برداری کے کام آنے کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد قرار دے لیا۔ خود "مولی مٹا صاحب" مرحوم کا جناتی چہرہ، لمبے لمبے کان اور جھکی ہوئی کمر جو "کتابے چند" کے بوجھ سے دہری ہوگئی تھی۔ مسکینی اور بار برداری کی چلتی پھرتی، چرتی چگتی تصویر معلوم ہوتی تھی۔ اور ہمارے لئے دلیلِ راہ کا کام دیتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری تعلیم و تربیت نے ہمیں نہ بارِ خاطر بننے دیا نہ یارِ شاطر بلکہ رشکِ فاطر بنا کے چھوڑ دیا۔

اب ہماری زندگی سفر اور حضر میں جس طرح گذرتی ہے اس کا کچھ تھوڑا سا اندازہ آپ کو ان دو قلمی تصویروں سے ہوگا۔

بھرے بازار میں ایک دہنگائی کا مارا راشن کا سنوارا مریل سا بھلا آدمی لدا پھندا، ٹکراتا، دھکے کھاتا چلا جا رہا ہے۔ داہنے ہاتھ میں ایک بڑی سی ٹوکری ہے۔ جسے ذات کے لحاظ سے ٹوکری کہہ لیجئے۔ مگر ظرف کی وسعت میں

جھوٹے سے کم نہیں، اور وہ ساگ، ترکاری، ادرک، پیاز، لہسن، ہری مرچ، پودینہ
ہیں، اور پان کی چھوٹی بڑی گڈیوں سے چوٹی تک بھری ہوئی بائیں ہاتھ میں بناسپتی
کا دس پونڈ کا ڈبہ ہے نیچے کی دونوں جیبوں میں دھنیا، ہلدی، گرم مسالے،
شکر، چھالیہ کتھے، بال جیون گٹھی اور جوشاندے کے پڑے اور پڑیاں ٹھسی
ہوئی ہیں۔ اوپر کی جیبوں میں دیاسلائی کی ڈبیاں، سوئی اور ہیرپن کے پتے
دھاگے کے ریل، سیپ اور ٹین کے بٹن ہیں۔ ایک بغل میں کنٹرول کے
بھاؤ خریدے ہوئے کپڑے کے بنڈے اور دوسری بغل میں بے بھاؤ کے
جوتوں کے ڈبے دبے ہوئے ہیں۔ یہ بن کرائے کا ٹٹو آپ کا تابعدار ہے
جو گھر والی اور ہمسائے والیوں کا سودا بازار سے خرید کر لے جا رہا ہے۔
ریلوے اسٹیشن کی بھیڑ بھاڑ میں ایک سگنل کی طرح دبلا پتلا لمبا مخلوق
ایک چلتے پھرتے سیاہ خیمے کی جلو میں بستروں اور صندوقوں سے لدے ہوئے
قلی کے ساتھ ساتھ اس ہیئت کذائی سے نظر آتا ہے کہ داہنی طرف کندھے
پہ تین سال کا نور چشم بائیں طرف بغل میں سوا دو سال کی نور چشمی، ایک ہاتھ سے
لخت جگر کو سنبھالے دوسرے ہاتھ میں ناشتہ دان، پاندان لٹکائے یہ بے پیسے
کا مزدور خاکسار، ذرہ بے مقدار ہے جو اپنے چچیا سسر کی خلیا ساس کے
قُل میں شرکت کے ارادے سے روانہ ہو رہا ہے۔
اس میں شک نہیں کہ جیسا شیخ سعدی نے فرمایا ہے۔ اس کمینی اور بار برداری
کی وجہ سے اپنے اور بیگانے ہمیں شدت سے عزیز رکھتے ہیں اور ہزاروں
مزدوروں کو چھوڑ کر جو چند پیسے کے عوض ان کا جنازہ تک اٹھانے کو تیار ہیں

اپنا سارا بوجھ ہمیں سے اٹھواتے ہیں۔ لیکن ایمان کی کمزوری کہئے یا فطرت کا تقاضہ ہمیں اکثر یہ خیال آتا ہے کہ جہاں ہم نے چچا سعدی کے ممدوح کی اور صفات سیکھی ہیں، وہاں دولتی جھاڑنا بھی سیکھ لیں تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔

۱۲

یکم جولائی ۱۹۵۰ء

مرزا صاحب کے بونے قد سوکھی چمڑی اور بوڑھی ہڈیوں کو دیکھ کر لوگ بے ساختہ کہہ اُٹھتے ہیں "چہ پدی اور چہ پدی کا شوربہ"۔ مگر جب سابقہ پڑتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پدی غوغائی سے کم نہیں۔ اس لئے کہ ماشاءاللہ آواز بڑی ٹھنٹھی اور کراری ہے اور اس سے کام بھی مرزا صاحب دل کھول کر یا یوں کہئے کہ پھیپھڑے کھول کر لیتے ہیں۔ بحث کا شوق ان کی گھٹی میں پڑا ہے اور وہ گھٹی نہ جانے کس غضب کی کڑوی تھی کہ اس کی تلخی آج تک باقی ہے۔ سنتے ہیں کہ علم کے لئے بحث بہت ضروری ہے مگر یہ مرزا صاحب نے ثابت کر دیا ہے کہ بحث کے لئے علم کی مطلق ضرورت نہیں، صرف دھونس اور ڈپٹ کافی ہے۔ الہیات سے لے کر فلکیات تک اور طبیعیات سے لے کر لغویات تک کسی موضوع پر کوئی بات کہی جائے۔ یہ ممکن ہے کہ مرزا صاحب اس کی تردید میں حنجرہ آزمائی نہ شروع کر دیں۔ مگر وہ اتائیوں کی طرح یہ نہیں کرتے کہ گلے کا پورا زور ایکدم سے لگا دیں بلکہ مشاق گویوں کی طرح مدھم سے شروع کر کے دھیرے دھیرے

پنچم تک پہنچتے ہیں اور ان کی تردیدی بحث کی شدومد بھی اسی طرح رفتہ رفتہ بڑھتی ہے۔ مثلاً آپ ان کے سامنے کسی سلسلے میں یہ بات کہیں کہ ہفتہ سات دن کا ہوتا ہے تو مرزا صاحب معمولی آواز میں، مگر کسی قدر جھنجھلاہٹ کے ساتھ فرمائیں گے "بھئی کیا بھیڑ چال خلقت ہے۔ باوا آدم کے زمانے میں کہیں کسی نے کہہ دیا ہوگا کہ ہفتہ سات دن کا ہوتا ہے۔ اب جسے دیکھیے وہی راگ الاپے جاتا ہے۔ دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ لوگ زمین پہ رینگتے رینگتے ہوا میں اڑنے لگے۔ راکٹ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ آب دوز پاتال کی خبر لانے لگی مگر ہفتہ کم بخت وہی سات دن کا چلا جاتا ہے"

اب اگر آپ سن کر منڈیا ہلا دیں یا کم سے کم دم سادھ لیں تو خیریت ہے اور جو کہیں آپ نے کہہ دیا۔

"مرزا صاحب اس میں بھیڑ چال کا کیا سوال ہے اور اسے دنیا کی ترقی سے کیا تعلق ہے۔ لوگوں نے ملکر ایک بات ٹھہرائی کہ سال کے دنوں کو سات سات دن کے ٹکڑوں میں بانٹ لیں۔ اور ہر ٹکڑے کو ہفتہ کہیں اور ہماری زبان میں تو اس کے لئے لفظ ہی وہ رکھا گیا ہے جس کے معنی سات کے ہیں۔ ظاہر ہے اگر سات دن کا نہ ہوتا تو ہفتہ کیوں کہلاتا"

اب مرزا صاحب کے مزاج کی حدت اور آواز کی شدت بڑھ جائیگی۔ ناک بھوں چڑھ جائے گی اور وہ آپ کا منہ چڑا کر کہیں گے "ظاہر ہے ظاہر ہے۔ آئے وہاں سے بڑے ظاہر شاہ کی دم بنکر۔ یہ بھی کوئی دلیل ہے کہ ہفتہ کہلاتا ہے اس لئے سات دن کا ہونا ضروری ہے۔ اور یہ کون کہتا ہے کہ ہفتہ

ہماری زبان کا لفظ ہے ہم تو اپنی نانی دادی سے اٹھوارہ سنتے آئے ہیں۔ اس لئے آپ ہی کی دلیل کے مطابق اسے آٹھ دن کا ہونا چاہیئے۔ اب لگے لغلیں جھانکنے کل کے لونڈے الف کے نام بھالا تک نہیں جانتے اور ہم سے بحث کرنے چلے ہیں۔"

آپ اگر چین اور آبرو کی سلامتی چاہتے ہیں تو اب بھی موقع ہے یا تو ہار مان لیجئے یا بات کو ٹال جایئے۔ لیکن آپ کی شامت ہی آگئی ہو اور آپ مسکرا کر یہ کہہ گذریں:۔

"مرزا صاحب آپ اتنے چراندھے کیوں ہوتے ہیں۔ آخر اس میں غصے کی کیا بات ہے۔ بحث میں غصہ آیا اور آدمی گیا گذرا۔ پھر وہ ایسی ہی اٹکل پچو باتیں کرنے لگتا ہے۔ جیسی اس وقت آپ کر رہے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ہفتے کو اٹھ وارہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے ختم ہوتے ہی آٹھواں دن شروع ہو جاتا ہے۔ اور پھر آپ کی نانی صاحبہ مرحومہ کی وفات کے بعد اس لفظ کا استعمال بھی تو بہت کم ہو گیا ہے۔ اس کا سہارا آپ بحث میں کیوں لیتے ہیں؟"

پھر تو بس "جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو" کا وظیفہ پڑھنے کے سوا کوئی تدبیر نہیں اور اس سے بھی کام چل جائے تو غنیمت ہے آپ کی بات ختم بھی نہیں ہونے پاتی کہ مرزا صاحب کی میرزائی آپے سے باہر ہو جاتی ہے۔ آستین چڑھ جاتی ہے، چہرہ تمتما اٹھتا ہے، آنکھیں ابل پڑتی ہیں، منہ سے جھاگ نکلنے لگتے ہیں اور جلتے، ابلتے، کھولتے فقروں کا سیلاب اس زور سے

آپ کی طرف موجیں مارتا ہوا بڑھتا ہے جیسے کوہِ آتش فشاں کا لاوا ہو۔

دیکھئے ہماری بات مان لیجئے۔ کبھی بھولے سے بھی مرزا صاحب سے بحث نہ کیجئے گا۔ ورنہ مفت میں جان جائیگی اور عاقبت الگ سے خراب ہوگی اسلئے کہ استاد کہہ گیا ہے۔ ؎

کشتۂ تیغ زباں مغفور نیست

سیاست

۲

۱

۱۶ر جولائی ۱۹۴۸ء

ہمارے دوست معدی کرب کا دل کسی قدر تنگ ضرور تھا۔ مگر معدہ
بہت فراخ تھا۔ ان کے والد ماجد پولیس میں سب انسپکٹر رہے تھے اور لوگوں کے
جان و مال کی حفاظت اس طرح کیا کرتے تھے کہ مال ان سے لے کر اپنے گھر
میں محفوظ رکھتے تھے اور جان کو جان آفریں کی حفاظت میں دے دیتے تھے۔
اس طرح اپنا نہیں تو دوسروں کا خون پسینہ ایک کرکے انھوں نے معقول جائیداد
پیدا کرلی تھی اور اسے اپنے چاروں بیٹوں کے لئے چھوڑ گئے تھے۔ جن میں سب
سے بڑے معدی کرب تھے۔ معدی کرب پہلی اولاد ہونے کی وجہ سے باپ
کے بڑے لاڈلے تھے۔ اس لئے انھوں نے تعلیم و تربیت بس واجبی ہی واجبی
پائی تھی۔ اور جتنی پائی تھی اسے بھی بے کار سمجھ کر کھو دیا تھا۔ البتہ کھانا اہتمام
سے پکواتے تھے اور اسے جوش و خروش سے کھانے کا ہنر انہیں آتا تھا۔ جوش
کھانے کے دوران میں نظر آتا تھا اور خروش کھانا ختم ہونے کے بعد سنائی
دیتا تھا۔ یہ ریاضت وہ عام طور پر خلوت میں کرتے تھے۔ جہاں تک ہو سکتا تھا
کسی دوسرے کو اس میں شریک ہونے کی زحمت نہیں دیتے تھے۔ مجھ سے

انھیں بڑی محبت تھی اور میرا معدہ کمزور اور خوراک کم تھی اس لئے کبھی کبھی مجھے ناشتہ پر بلا لیتے تھے جو مقابلتاً سادہ ہوتا تھا یعنی چائے، توس، انڈے، مکھن بالائی، پراٹھے، کباب اور حلوے کے سوا اس میں اور کوئی چیز نہیں ہوتی تھی

تینوں چھوٹے بھائیوں کو انھوں نے حب وطن اور کفایت کی خاطر ایک قومی مدرسہ میں داخل کر دیا تھا۔ جہاں اس سے کم خرچ ہوتا تھا جتنا گھر پر رہ کر ہوتا۔ ایک دن میں ناشتے کے وقت ان کے یہاں پہنچا تو انھیں کچھ متفکر پایا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ان کے تینوں بھائی چھٹی میں گھر آنے والے ہیں۔ فکر اس کی تھی کہ اس مہنگائی کے زمانے میں اگر تینوں برادران خرد کے لئے بھی ناشتہ اور کھانا بہ نسخہ کلاں پکا تو خرچ کیسے چلے گا۔ اور اگر نسخہ کے اجزا میں کمی کر دی گئی تو کام کیسے چلے گا۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ آپ کو شریعت کی پابندی کی ایسی کیا ضرورت پڑ گئی ہے کہ بھائیوں کے ساتھ کھانے میں مساوات برتی جائے۔ چودھری خلیق الزماں صاحب نے فرما ہی دیا ہے کہ جو شریعت کا نام لے وہ پاکستان کا دشمن ہے۔ تعلقہ داری کے قانون کے مطابق آپ بھائیوں کو وہ کھانا کھلایئے جس میں ان کا "گذارہ" ہو جائے اور آپ وہ کھایئے جس میں آپ کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہوں اور سر کڑھائی میں۔ انھوں نے بڑی حسرت کے ساتھ کہا۔ " اب تعلقہ داری کا ست جگ کہاں رہا۔ اب تو جمہوریت کا کلجگ ہے"۔ میں نے کہا " پھر کیا ہوا جمہوریت میں تو اور بھی مزے ہیں۔ ووٹ سب کے اور مال یاروں کا۔ ع جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا "

کہنے لگے کہ بھائی دو ڈٹ مل کر وہ اودھم مچاتے ہیں کہ مال ہضم نہیں ہونے دیتے۔ میں نے کہا خیر جمہوریت نہ سہی اشتراکیت سہی میری اور آپ کی ناشتہ میں شرکت رہتی ہے مگر اس طرح سے

کہ جو شریک ہے میرا شریک غالب ہے

ناشتہ قریب قریب سالم بلکہ مسلم آپ کا ہوتا ہے۔ میرے حصے میں چھوٹی سی کسر آتی ہے اور پھر بھی پیٹ میں کسر رہ جاتی ہے۔ بولے میاں کیا باتیں کرتے ہو۔ اشتراکیت وہاں کام آتی ہے۔ جہاں شریک کا ہاضمہ کمزور ہو وہ تینوں تو کمبخت اسکول و کالج کے لڑکے ہیں جن کے معدے کی تھاہ آج تک کسی نے نہیں پائی۔ میں نے دیکھا ان کی کسی طرح تسکین نہیں ہوتی تو آخری دلیل سے کام لیا جو آج کل ان جیسے لوگوں کا آخری سہارا ہے عرض کی کہ اور کچھ نہیں تو فسطائیت تو کہیں نہیں گئی۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اس بات کو سن کر انھیں کسی حد تک سکون ہوا۔ مگر پھر سوچ میں پڑ گئے تھوڑی دیر کے بعد اس طرح جیسے اپنے دل سے باتیں کر رہے ہوں۔ آہستہ آہستہ بولے۔ ہاں جس کی لاٹھی .... اُس .... کی بھینس ...... مگر ...... مگر ...... کیسے معلوم ہو کہ کس کی لاٹھی؟ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

۲

۲۴ ستمبر ۱۹۴۸ء

"کہئے میر صاحب تیسری پیالی حاضر کروں"
"بھئی یہ تو بڑی مشکل ہے۔ آپ اصرار کرکے تین چار پیالیاں پلا دیتے ہیں اور یہاں یہ حال ہوتا ہے کہ دامن تر اور دماغ خشک"
تبھی سے کہیں یہ کشتِ زعفران خشک ہوگئی تو لطفِ محفل ہی جاتا رہیگا آپ رہنے دیجئے، میں خود پئے لیتا ہوں"
"خیر اب آپ کو اصرار ہے تو دے ہی دیجئے مگر زرا بالائی زیادہ ہو تاکہ خشکی نہ کرے"
"لیجئے بسم اللہ، چسکی لیتے جایئے اور اپنی بانی جاری رکھئے، ہاں وہ فلسطین اور حیدرآباد کا کیا قصہ تھا"
"ارے میاں کیا کہیں، کوئی قدرداں ہو تو اسے سنائیں ہم تو کس کس جتن سے دور کی کوڑی لائیں اور آپ لوگ ہنسی میں اڑا دیں"
"نہیں میر صاحب ہنسی تو آپ کے انداز بیان پہ آتی ہے نفسِ مضمون پر ہم سب سر دھنتے ہیں"
"یہ بھی ایک ہی رہی۔ ارے انداز پہ آئی تو کیا اور ناز پہ آئی تو کیا، ہماری تو کرکری ہو جاتی ہے"
"میر صاحب جتنی چھانئے گا اتنی ہی کرکری نکلے گی۔ آپ تو آنکھ بند کرکے

پی جایا کیجئے"۔

"بھئی خوب کہی۔ اسی بات پہ سنئے، آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ ہمارے زمانے میں جو دبنگ زمیندار ہوتے تھے، وہ کیا کرتے تھے کہ کسی گاؤں کے بیچوں بیچ میں ایک پٹی خرید لی۔ پھر کیا تھا ان کا کھونٹا وہاں گڑ گیا اور دوسرے پٹی داروں کی کور دبنے لگی۔ آج اپنی زمین تک پہنچنے کے لئے گاڑھی بھر رستہ مانگ رہے ہیں کل مینڈ کا جھگڑا اکھڑا کر دیا۔ کبھی گالی گلوج، کبھی لاٹھی پونگا۔ کبھی تھانہ کچہری غرض سب پٹی داروں کا ناک میں دم آجاتا تھا۔ سو حضرت یہی داؤں یار لوگ فلسطین میں کھیل رہے ہیں اور حیدر آباد میں کھیلنا چاہتے تھے۔ فلسطین میں تو پو بارے ہیں۔ اس بچارے برنا دوت کو جسے پنچ بنا کر بھیجا گیا تھا۔ سر پھرے یہودیوں نے ٹھکانے لگا دیا۔ اب کیا ہے۔ جب چاہیں یہودیوں کو سزا دینے کے بہانے فوج لے آئیں اور ڈیرے ڈال کر بیٹھ جائیں۔ چلئے پٹی دار بن گئے۔ مگر حیدر آباد میں قسمت کے تین کانے ہی آئے۔ وہ رضا کار محض ناکارہ ہی نکلے۔ پہلے ہی ہلے میں چیں بول گئے۔ خرانٹ کلا کار نے جو قاسم رضوی اور ان کے رضا کاروں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچا رہا تھا۔ عین وقت پہ تار کاٹ دیئے۔ چلئے تماشہ ختم اور پیسہ ہضم۔ یہاں تو پٹی داری کی امیدوں پہ پانی پھر گیا۔ اب کشمیر رہ گیا ہے۔ سنا ہے وہاں نقشہ خسرہ بن رہا ہے۔ کھتونی مرتب ہو رہی ہے۔ فکر یہ ہے کہ بٹوارہ ہو اور اس طرح ہو کہ ایک پٹی یار لوگوں کے لئے بچ جائے۔ امین، بٹواری سب بٹوارہ کرنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ صرف فریقین کو پٹی پڑھا کر راضی کرنا ہے۔ ارے لاحول ولا قوۃ، باتوں میں خیال ہی

نہیں رہا۔ چائے ٹھنڈی ہوگئی۔"

۳

(الف) ۱۶ راکتوبر ۱۹۴۸ء

"کیوں حضرت آپ نے تو بہت سی لغت کی کتابیں چاٹ ڈالی ہیں، کیا لیڈر کے لئے ہمارے ہاں کوئی لفظ نہیں جو ہم یہ مکروہ انگریزی لفظ استعمال کرتے ہیں؟ جب سے سُنئے لیڈر، لیڈر، لیڈر، کان پک گئے سُنتے سُنتے۔ آخر پیشوا، رہنما رہبر، زعیم، قائد کہتے کیا زبان گھستی ہے؟"

"زعیم اور قائد کہنے میں تو ضرور گھستی ہے، بلکہ اگر خشوع وخضوع کے ساتھ کہئے تو حلق میں خراش بھی آجاتی ہے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ ان سب لفظوں میں خصوصیت ہے اور لیڈر میں عمومیت ہے۔"

"کیا مطلب آپ کا؟ یعنی لیڈر میں کوئی خصوصیت ہی نہیں۔ تو پھر لیڈر کیوں بنا پھرتا ہے؟"

"ارے بھئی مطلب یہ ہے کہ اور سب لفظوں کا مفہوم خاص ہے اور لیڈر کا مفہوم عام ہے۔"

"اور آپ کا مفہوم بندے کے فہم سے باہر ہے۔"

"گھبرائیے نہیں ابھی آپ کے فہم کے اندر سما جائے گا۔ دیکھئے "پیشوا" روحانی نجات کی راہ دکھانے والوں کے لئے مخصوص ہے۔ "رہنما" اور "رہبر"

اخلاقی ہدایت کرنے والوں کے لئے۔ زعیم وہ سیاسی نیتا جو گرجتا اور ہنکارتا ہے
ع۔ نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے
اور قائد وہ ہے جو دوسروں کو قید و بند میں رکھتا ہے اور خود ہر قید سے آزاد ہوتا ہے۔ دیکھا آپ نے ان لفظوں کے مفہوم محدود ہیں۔ مگر لیڈر ان سب پر حاوی ہے۔"

"سب پر حاوی نہ ہو تو لیڈر کاہے کا۔ مگر پھر بھی بات صاف نہ ہوئی۔ آخر ان پانچوں میں اور لیڈر میں کیا خاص فرق ہے؟"

"یہی فرق ہے کہ اور سب اضافی اصطلاحیں ہیں اور لیڈر مطلق ہے۔"

"پھر وہی موٹے موٹے لفظ، حیوان مطلق، جاہل مطلق تو سنا تھا یہ خالی مطلق کیا بلا ہے؟"

"شاید آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں لیڈر کی منطقی تعریف کروں اور یہ بہت مشکل ہے۔"

"حضرت میں بالکل نہیں چاہتا کہ آپ لیڈر کی کسی قسم کی تعریف کریں میں تو صرف یہ پوچھتا ہوں کہ لیڈر کہتے کس کو ہیں۔"

"بھئی آپ کو کیسے سمجھاؤں۔ سچ پوچھئے تو لیڈر ہر اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے آپ کو لیڈر کہتا ہے۔"

۴

(ب) ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۸ء

"بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ جو اپنے آپ کو لیڈر کہے وہ لیڈر رہے"۔

"بات کیوں نہیں ہوئی۔ ارے بھئی لیڈر کی تعریف اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے۔ یہی سب لیڈروں میں قدرِ مشترک ہے اور یہی ان میں اور دوسروں میں مابہ الامتیاز"۔

"قبلہ! آپ نے تو اور بھی بڑے بڑے پتھر لڑھکانے شروع کر دیئے مشترک تو قدرے سمجھ میں آ بھی گیا، مگر یہ "مابہل" تو کسی طرح گلے نہیں اترتا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے موٹی سی گالی دے دی"۔

"معلوم نہیں آپ مجھے بنانے کے لئے بنتے ہیں یا بنے بنائے ہیں۔ خیر! اب سن لیجئے۔ قدرِ مشترک وہ صفت ہے جو ایک نوع کے سب افراد میں موجود ہو۔ سب پرندوں میں یہ صفت ہے کہ وہ اڑتے ہیں۔ سب لیڈروں میں ——————"

"............ یہ صفت ہے کہ وہ اُڑاتے ہیں بے پر کی۔ اب سمجھ گیا"۔

"خاک سمجھ گئے، میں یہ کہہ رہا تھا کہ سب لیڈروں میں قدرِ مشترک ادعا ہے۔ یعنی ہر ایک لیڈر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اپنی زبان سے اپنے آپ کو لیڈر کہتا ہے"۔

" ہاں! ہاں صاحب!! وہی مثل ہے کہ اپنے منہ میاں مٹھو۔ مگر یہ بے پر کی اڑانی نہیں ہوئی تو اور کیا ہوئی؟ آپ تو خواہ مخواہ کی حجت کرتے ہیں "۔

" اچھا آپ یوں ہی سمجھ لیجئے۔ اب رہا مابہ الامتیاز۔ یہ اس صفت کا نام ہے جو ایک نوع کی ایک جنس میں ہو اور دوسری میں نہ ہو۔ مثلاً یہی اُڑنے کی صفت کہ پرندوں میں ہے۔ انسانوں اور دوسرے جانوروں میں نہیں پائی جاتی "۔

" سو لیڈروں کے۔ وہ تو ایسے اُڑتے ہیں کہ کیا کوئی پکھیرو اُڑے گا۔ یوں تو خیر پیر بھی اُڑتے ہیں مگر انھیں اُڑانے کو مرید ہونے چاہئیں۔ لیڈر کو اس کی ضرورت نہیں، وہ اپنی ہوا میں آپ ہی فرّاٹے بھرتا ہے "۔

" ارے بھئی، یہ اڑنا استعارہ ہے، پرندوں کا اُڑنا حقیقت ہے، مگر بات آپ ٹھیک کہتے ہیں ——— اچھا تو لیڈر ——— "

" میں کتنی ہی ٹھیک بات کہوں، آپ مین میکھ نکالے بغیر نہیں رہتے خیر آگے چلئے۔ اچھا تو لیڈر "

" اپنی نوع کے دوسرے لوگوں سے اس بات میں امتیاز رکھتا ہے کہ وہ خود اپنی زبان سے لیڈری کا دعویٰ کرتا ہے۔ اور دوسرے اپنی بڑائی کا کم سے کم صریحی یعنی کھلا ہوا دعویٰ نہیں کرتے "۔

" جی، اور یہ شاعر حضرات کیا ڈھکا ہوا دعویٰ کرتے ہیں۔

ع۔ سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا

کہیئے اس سے بڑھ کر آپ کا لیڈر کیا کہے گا "۔

"یہ آپ نے بجا فرمایا۔ شاعر بے شک اس صفت میں لیڈر کے ساتھ شریک ہے بلکہ ان میں بعض اور چیزیں بھی مشترک ہیں۔ دونوں میں تخیل کی فراوانی ــــــــــــ"

"ارے صاحب! صاف صاف کہیئے نا کہ دونوں بے پر کی اُڑاتے ہیں۔"

"اچھا بابا یوں ہی سہی، تمہاری تسلّی تو ہو کسی طرح۔"

۵

(ج) یکم نومبر ۱۹۴۰ء

"مگر یہ تو کہیئے مولانا۔ سچ مچ ہر لیڈر لاابالی لیڈر ہوتا ہے۔"

"صرف ایک قسم اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ ہے مگر وہ شاذ ہے اور الشاذ کالمعدوم۔"

"اللہ رحم کرے پھر عربی تخولیا کا دورہ پڑ گیا۔ آپ کو زحمت نہ ہو تو ذرا نیچے سروں میں فرما دیجئے کہ لیڈروں کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں اور ان میں کوئی ایسی قسم بھی ہے جو اپنا ڈھنڈورا آپ نہ پیٹتی ہو۔"

"آپ لیڈروں کی قسمیں متعین کرنا چاہتے ہیں؟ کس اعتبار سے۔"

"ابجی اعتبار کا تو نام ہی نہ لیجئے۔ کیوں خواہ مخواہ منہ کھلواتے ہیں۔ آپ تو بس قسمیں بتا دیجئے!"

"آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ آخر تقسیم کے لئے کوئی جہت تقسیم بھی چاہیئے۔ خیر میں آپ کو سمجھانے کے لئے لیڈروں کی قسمیں الفاظ کی اقسام لغوی کے قیاس پر بتاتا ہوں۔"

"لغوی اغوی نہیں حضرت ٹھیک بات بتایئے۔"

"دیکھئے لفظ کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم ہے فصیح اور مستند، جسے ٹکسالی کہتے ہیں۔ لیڈروں میں بھی بعض ٹکسالی لیڈر ہوتے ہیں۔"

"میں سمجھ گیا۔ بھئی واللہ کیا بات کہی ہے۔ ٹکسالی لیڈر کھرا سکہ ہے۔ جسے اپنی قیمت منہ سے بتانے کی ضرورت نہیں۔ اس کے چہرے پر لکھی ہوتی ہے جب چاہیئے بجا کر دیکھ لیجئے۔ کھن سے بولے گا۔"

"آپ کا نفس مطلب صحیح ہے اگرچہ انداز بیان غیر علمی ہے۔"

"جی جناب یہ علمی نہیں عملی بات ہے۔ بڑے تجربے کے بعد آتی ہے مگر آپ نے ٹکسالی خوب کہا۔ چوکھا مال 'کھرا سکہ'، کھوٹ کھپٹ کا نام نہیں ایک اور چیز ہے۔ ٹکسالی لیڈر بھی ٹکسالی سکہ کی طرح بغیر کسی کوشش کے چلتا ہے۔ اور وہ بھی پورے سولہ آنے میں۔ یہ نہیں کہ اپنے کو دکان دکان لئے پھرے کہ کسی طرح چل جاؤں چاہے بٹہ ہی لگ جائے۔"

"ماشاء اللہ آپ تو خود بڑے نقاد ہیں۔ آپ کو کسی سے استفادے کی کیا ضرورت ہے۔ اب مجھے اجازت ہو تخفیف تصدیع۔"

"چلتے چلتے ایک تیھی اور جڑ دی۔ مگر مولانا آپ کہیں برا تو نہیں مان گئے۔ دیکھئے بات یہ ہے کہ لیڈر جیسی چلتی رقم کی خاصیت تو ہم ہی کو خوب معلوم

ہے۔ اس لئے کہ ہم روز برتتے ہیں نا۔ ہاں قسمیں اور اُن کے نام آپ سے پوچھ لیتے ہیں۔ نام کے عالم آپ ہیں۔ اچھا تو آپ جا ہی رہے ہیں۔ خدا حافظ! کسی دن دولت خانے پر حاضر ہو کر لیڈر کی اور قسمیں بھی پوچھوں گا۔

۶

(د) ۸ر نومبر ۱۹۴۸ء

"ہاں، مولانا، وہ اس دن آپ نے لیڈر کی قسمیں بتانی شروع کیں اور بیچ میں کڑک ہو گئے، آخر بات کیا تھی؟"

"آپ کے سوال کے ساتھ ہی جواب بھی صادر ہو جاتا تھا۔ اس لئے میں نے کچھ کہنا تحصیل حاصل سمجھا"۔

"واللہ یہ صادر کی خوب کہی، اتنی عربی سمجھ لیتا ہوں، مگر یہ تحصیل حاصل کس ضلع میں واقع ہے"۔

"جی تحصیل حاصل یہ ہے، جیسے کوئی احمق کو حماقت کی ترغیب دے"۔

"یعنی اُلّو کو اُلّو بنائے۔ دیکھئے مولانا اب آپ بڑھ چلے، پھر شکایت نہ کیجئے گا"۔

"بھئی میرا مطلب یہ ہے کہ جب آپ ہر نوع کے لیڈروں کے افعال و خواص سے اچھی طرح واقف ہیں تو پھر مجھ سے ان کی اقسام کیا پوچھتے ہیں آپ کو مسمّیٰ سے مطلب ہے یا اسم سے؟"

"جی مجھے تو اسم مسمّٰی، مسمّاۃ سبھی سے مطلب ہے اپنی اپنی جگہ سب ہی کام دیتے ہیں۔ دیکھئے مولانا بات یہ ہے کہ جب تک کوئی چوکھا نام نہ ہو، چیز کا جوہر اچھی طرح کھلتا نہیں۔ آپ سچا، اصلی، حقیقی لیڈر کہئے، مگر وہ بات کہاں جو ٹکسالی میں ہے۔ اسی طرح لیڈروں کی جو قسمیں ٹکسال باہر ہیں، ان کے لئے بھی ایسے ہی پھبتے ہوئے نام بتا دیجئے آپ کو دعا دیں گے کہ خدا بھوک اور ہاضمے میں ترقی دے۔"

" یہ تو اس معاشی ضیق کے زمانے میں بد دعا ہوئی۔ خیر تو ہم الفاظ کے قیاس پر لیڈروں کی اقسام متعین کر رہے تھے۔ غیر مستند الفاظ میں پہلی قسم متروک لفظوں کی ہے۔"

" واہ وا متروک بھی خوب ہے۔ اترا شحنہ مردک نام چُھٹی ہوئی پھلجڑی طلاقی جورو، پرانا ٹائم ٹیبل، پچھلے سال کی جنتری، ان سب فقروں کا نچوڑ ایک متروک کے لفظ میں آ گیا، آپ کو کبھی کاہے کو سابقہ پڑا ہوگا، ہم جیسے گناہ گاروں پر، جو اپنے گھر کھانا کھاتے ہیں۔ متروک لیڈر اکثر نزلے کی طرح گرتے ہیں۔"

" یعنی آپ نے ان کو ترک کر دیا، وہ آپ کو ترک کرنا نہیں چاہتے۔"

"جی ہاں مولانا کیا بتاؤں کمّل نہیں چھوڑتا۔ صرف مہمان داری کی بات ہو تو بھی غنیمت ہے۔ کسی طرح چوری کر کے ڈاکے کا پوت پورا کیا جائے مشکل تو یہ ہے کہ دربارداری اور تیمارداری بھی کرنی پڑتی ہے۔"

"دربارداری تو خیر سمجھ میں آتی ہے۔ اس کے بغیر لیڈر کے حب جاہ

کو تسکین نہیں ہوتی۔ مگر تیمار داری کیسی کیا ہر متروک لیڈر کا مریض ہونا لازمی ہے؟"

"لازمی تو میں جانتا نہیں مگر ہوتا یہی ہے متروک لیڈر مریض بھی ہوتا ہے اور مجروح بھی۔ اس کے قلب میں حسد کا مرض ہوتا ہے جس میں خدا نے ایسی برکت دی ہے کہ کبھی کم نہیں ہوتا بڑھتا ہی رہتا ہے۔ اس کے سینے میں حسرت کے ناسور ہوتے ہیں جو کبھی بھرنے میں نہیں آتے۔"

"تو ایسے مریض اور جراحت کی تیمار داری کرنا بڑا ثواب ہے۔"

"ثواب نہیں مولانا سخت عذاب ہے۔ تیمارداری تو اس کی ثواب ہے جو بیماری کی دوا چاہتا ہو۔ جیسے زخم کے مرہم کی تلاش ہو۔ جس شخص کو اپنے ناسور کی نمائش کرنے میں لطف آتا ہو، جو دوسروں کے کچو کے لگا کے خوش ہوتا ہو۔ جیسے زہر اگلنے سے تسکین ہوتی ہو۔ اس کی تیمار داری روح کو بیمار کر دیتی ہے۔"

"آپ اور یہ سنجیدہ گفتگو بڑے تعجب کا مقام ہے۔"

"معاف کیجئے، میں بھول گیا تھا کہ آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔"

(۸) ۱۶ر نومبر ۱۹۴۸ء

"اچھا صاحب ایک ہوا مستند ٹکسالی لیڈر، ایک متروک لیڈر، دو کے دو ہی دو، اب آگے چلئے۔"

"علیٰ ہذا القیاس"

"دیکھئے مولانا آپ نے پھر دھاندلی کی، عربی میں غرّانے کی نہیں بدی تھی۔"

"آپ کے لئے تو عربی کا ہر لفظ لاحول ہے، خیر مطلب یہ ہے کہ تیسری قسم کو آپ غیر مانوس یا غریب کہہ سکتے ہیں۔"

"بھئی واہ! کہاں غیر مانوس، کہاں غریب، آپ نے دونوں کو لے کر "یا" کی آلپین سے نتھی کر دیا، غیر مانوس لیڈر تو اپنے محل میں میر فرش کی طرح قالین پر دھرا رہتا ہے۔ غریب لیڈر بیچارا غریبوں کی جھونپڑیوں میں ان کے ساتھ چٹائی پر بیٹھتا ہے۔"

"آپ سمجھے نہیں یہاں غریب عرفی معنی میں نہیں لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔"

"جی میں عرفی، لغوی، سعدی، حافظ تو جانتا نہیں۔ اتنا جانتا ہوں کہ غریب تو غریب ہی ٹھہرا۔ اسے جیسے چاہئے استعمال کر لیجئے۔"

"خیر اس نزاع لفظی کو چھوڑئے، آپ غیر مانوس ہی کہئے۔ اچھا تو غیر مانوس لیڈر ــــ"

"معاف کیجئے گا، اب داؤں میرا ہے۔ مجھے کہنے دیجئے۔ غیر مانوس لیڈر جاپانی میکاڈو کی طرح چاہتا ہے کہ لوگ اسے سات پردوں کے اندر طاق میں بٹھا کر دور سے پوجا کریں۔ اس کا سمرن بہت ہوتا ہے، درشن بہت کم۔ اس کا سکہ اس کے نام سے چلتا ہے، چہرے سے نہیں۔"

"آپ نے تو لیڈر کو بالکل لات وہبل بنا دیا۔"

"تو یہ کیجئے، بھلا میں ایسی حرکت کر سکتا ہوں، اُس کی اُمت مار مار کے بھرکس نہ نکال دے۔"

"ایسے لیڈر کے پیچھے تو لوگ دیوانے ہو جاتے ہیں مولانا۔ جتنا وہ آپ کو دُور کھینچتا ہے اتنے ہی اس کی طرف کھنچتے ہیں۔ جتنا وہ دُتکارتا ہے اتنی ہی دم ہلاتے ہیں۔"

"اور جو کہیں پہ وہ اُٹھ جائے۔"

"تو بس قیامت ہی آجائے۔"

۸

(۹) ۲۴ نومبر ۱۹۴۸ء

"بہت اچھا مولانا، خدا آپ کو بہشت نصیب کرے لگے ہاتھوں لیڈروں کی اور قسموں کے نام بھی بتا ڈالیئے۔"

"میری جان بخشی کیجئے، آپ تو قضائے مبرم کی طرح پیچھے پڑ گئے مجھے مدرسے کو دیر ہوتی ہے۔ طلاب منتظر ہوں گے۔"

"ابھی طلاب کو جلاب پھر دے دیجئے گا۔ پہلے میری قضائے حاجت تو فرما دیجئے۔"

"بھئی الفاظ کی قسمیں تو بے شمار ہیں، مجھ سے کیا حماقت سرزد ہوئی کہ الفاظ کے قیاس پہ لیڈروں کی تقسیم شروع کر دی۔"

"مولانا حماقت نہیں، آپ سے عقل مندی سرزد ہو گئی، لفظوں اور لیڈروں میں بڑی مشابہت ہے۔ دونوں حرفوں کے بنے ہوتے ہیں۔"

"خیر، سنیئے۔ غیر مستند الفاظ کی دو اور بڑی قسمیں ہیں جو قابلِ ذکر ہیں۔ عامیانہ اور سوقیانہ، ان کے مقابلے میں غیر مستند لیڈروں کی بھی دو اور قسمیں عامی اور سوقی قرار دی جا سکتی ہیں۔"

عامی تو میں سمجھ گیا یعنی ٹکسالی لیڈر کا خوردہ یا ریزگاری، مگر اس کو آپ نے غیر مستند کیسے کہہ دیا ہے وہ ٹکسالی کی طرح سولہ آنے لیڈر نہ سہی مگر ہے تو اسی کی کسر آخر اٹھنی، چونی، دونی، اکنی، ادھنا، خالی پیٹ کا پیسہ۔ یہ سب بھی تو ٹکسال ہی میں گھڑے جاتے ہیں۔ جیسے خردے کے بغیر عام ضرورت کی چیزوں کا ہاتھ آنا مشکل ہے، اسی طرح عامی لیڈروں کے بغیر عوام کو ہاتھ میں لینا اور ہاتھ میں رکھنا دشوار ہے۔ آپ یوں سمجھ لیجئے کہ عامی لیڈر بڑے لیڈر کا بھونپو ہے جو اس کی آواز کو پھیلاتا اور بھیلاتا ہے۔ خیر، یہ تو ہوا عامی لیڈر، مگر مولانا دوسری قسم کا نام آپ نے سوقی بتایا تھا، یہ سوقی کیا بلا ہے؟"

"سوقی وہی جسے آپ بازاری کہتے ہیں۔"

"یا اللہ تیری پناہ! بازاری لیڈر خطرۂ جان، خطرۂ ایمان، خطرۂ ہندوستان خطرۂ پاکستان، آگ کھاتا ہے، انگارے اگلتا ہے۔ بس بوتا ہے۔ بس کے رو کھ اگاتا ہے۔ نعرے اس کا دعوے، گالیاں اس کی دلیل، بھڑکانا اس کا کام، لڑوانا اس کا کھیل، جان کی بازی لگاتا ہے، اپنی نہیں، دوسروں کی جان کی، سر کا سودا کرتا ہے، اپنے نہیں، دوسروں کے سر کا، کوئی جیتے یا ہارے

اس کے بیوپارے، کوئی جیئے یا مرے، اس کے دام کھرے "
" ماشاء اللہ آپ تو جوش خطابت میں شاعری فرمانے لگے، خیر اب مجھے اجازت دیجئے، بہت دیر ہو گئی "
" مگر مولانا مقطع کا بند تو رہ گیا، لفظوں کی ایک قسم مہمل بھی تو ہوتی ہے، اس کے مقابلے میں مہمل بڑر ———— "
" اسے اپنا تخلص سمجھ لیجئے۔ السلام علیکم "

۹

۱۶ مئی ۱۹۴۹ء

" آیئے ماسٹر صاحب۔ اب تو آپ کے درشن ہی نہیں ہوتے "
" کیا کہوں رائے صاحب درشن کی ہوک تو مجھے بھی بہت اُٹھتی ہے مگر اس راشن کی بھوک نے کہیں کا نہ رکھا "
" ارے بھائی اب رائے صاحب کہہ کر کیوں جلاتے ہو۔ جب خطاب دینے والے ہی نہیں رہے تو خطاب کیسا ؟ "
" ہے ہے آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں! کیا انگریز بہادر کو کچھ ہو گیا ؟
" نہیں ان کو کیا ہونا تھا۔ یہ انہونی تو ہماری قسمت میں لکھی تھی "
" میرا تو دل دھک سے رہ گیا۔ خدا آپ کو مانگ کوکھ سے ٹھنڈا رکھے۔ ایسی بُری فال منہ سے نہ نکالا کیجئے "

"اس بڑھاپے میں مسخرے پن کی باتیں کرتے شرم تو نہ آتی ہوگی؟"

"آتی تو ہے مگر دُور سے شرما کر لوٹ جاتی ہے۔ خیر، آپ شرم کی بات کو چھوڑیئے۔ یہ بتایئے کہ جب انگریز بہادر موجود ہیں تو آپ کا خطاب کیسے کھل گیا؟"

"جہاں ہوں گے وہاں ہوں گے، ہندوستان سے تو گئے۔"

"ہندوستان سے گئے تو کیا ہیرا پھیری سے بھی گئے؟ اور اب تو ہم نے کامن ویلتھ کا رشتہ منظور کر لیا ہے اور بادشاہ کو بھی اس رشتے کی علامت کے طور پر مان لیا ہے۔ آخر آپ کا خطاب بھی تو اسی کی علامت ہے پھر اسے نہ ماننے کی کیا وجہ ہے؟"

"ہاں ماسٹر صاحب خوب یاد دلایا۔ یہ کامن ویلتھ کا کیا قصہ ہے اور علامت سے کیا مطلب ہے؟"

"جی یہ سلامت کا قافیہ ہے۔ پہلے بادشاہ سلامت ہوتے تھے۔ اب بادشاہ علامت ہوا کریں گے۔"

"پھر وہی مسخراپن، ذرا دیر کے لئے ماسٹر سے آدمی بن جایئے اور مجھے یہ سمجھا دیجئے کہ کامن ویلتھ کا نیا رشتہ کیا ہے اور بادشاہ کو علامت سمجھنے کے کیا معنی ہیں۔"

"رائے صاحب میں آپ کو کیا سمجھاؤں اور کیسے سمجھاؤں۔ یہ حقیقت کے باریک نکتے ہیں جو لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتے۔ معرفت کے نازک مقامات ہیں جو نقشے میں نہیں دکھائے جا سکتے۔ دیکھنا ہے تو دل کی آنکھوں

سے دیکھئے چشم ظاہر کے آگے ایک حجاب حائل ہے جسے رفع کرتے ہاتھ کانپتا ہے۔ ع

پردہ ڈالا ہے وہ اس نے جو اٹھائے نہ بنے

۱۰

۸ ر جون ۱۹۴۹ء

(کھٹ، کھٹ، کھٹ کھٹ۔ آہن سازی کا کام جاری ہے)

پہلا کاریگر :۔ اس گرمی نے تو بولا دیا اُستاد۔ معلوم ہوتا ہے سارا مغز پسینے کے ساتھ بہہ جائے گا۔

دوسرا :۔ (انگڑائی لے کر) ہاں اُستاد کام پہ دل جمتا نہیں۔ سر میں بھٹی سی جل رہی ہے۔ بدن میں کس نہیں رہا۔ ہاتھ اوچھا پڑنے لگا۔ میں تو ڈرتا ہوں کہ کہیں کڑیاں کچّی نہ رہ جائیں۔ آپ کہتے ہیں کہ آہن کی زنجیر اتنی مضبوط ہو کہ آزادی کے قیدی لاکھ جھٹکے دیں مگر زنجیر تُڑا کر بھاگنے نہ پائیں پھر بھلا اس موسم میں ــــــــــ

اُستاد :۔ آخر تم لوگوں کا مطلب کیا ہے؟

دوسرا :۔ مطلب یہ ہے اُستاد کہ کچھ دن کی چھٹی ہو جائے۔ بس مینہ کا پہلا چھینٹا پڑا اور ہم لوگ پھدکتے تڑاتے آن موجود ہوں گے۔ پھر کام کھٹ کھٹ کی جگہ کھٹا کھٹ ہونے لگے گا اور اتنے دن ناغے کی

ساری کسر نکل جائے گی ۔

اُستاد :۔ خبردار جو ایسی بات منہ سے نکالی ۔ یہ بھی کوئی اسکول کالج مقرر کیا ہے ۔ جہاں کام کے تھوڑے سے دن بہت سی چھٹیوں میں اس طرح کھو جاتے ہیں ۔ جیسے آج کل پانی میں دودھ کھو جاتا ہے ۔ تم جانتے ہو کہ ہم نے جتنی مدت میں کام ختم کرنے کا ٹھیکہ لیا تھا وہ کب کی گذر چکی ۔ کئی بار مہلت ملی مگر پھر بھی کام ختم نہیں ہوا ۔ اب آخری مہلت ۱۵ ر اگست تک کی ہے ۔ بھلا یہ بھی کوئی چھٹی منانے کا وقت ہے ۔

(دونوں پھر ہتوڑی چلانے لگتے ہیں ۔ مگر بے دلی سے ہلکے ہلکے ۔)

ایک نوسکھیا :۔ اُستاد قصور معاف ہو تو عرض کروں کہ اگر سارے وقت آئین گھڑنے کا کام یہی دونوں کرتے رہے اور وہ بھی اس طرح دھیرے دھیرے سم تال کے ساتھ تو میں ضرور اونگھ جاؤں گا ۔ ایک تو گرمی کے مارے یوں ہی سستی آرہی ہے اور پھر یہ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کی لوری سُن کر بے اختیار آنکھیں بند ہو جاتی ہیں یا تو ان دونوں کی بدلی کیجئے یا پھر مجھے سونے کی اجازت دیجئے ۔

پہلا کاریگر :۔ اُستاد اسے شوق سے سو جانے دیجئے ۔ چہ خفتہ چہ بیدار ۔

دوسرا :۔ استاد اسے ہرگز نہ سونے دیجئے گا ۔ ورنہ مجھے سخت شکایت ہوگی بھلا آئین سازوں کی اس سے بڑھ کر اور کیا توہین ہو سکتی ہے کہ وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اپنا کاری گری کا کمال دکھائیں اور لوگ

پاؤں پسار کر سوئیں۔

نو سکھیا:۔ (سوتی ہوئی آواز میں گنگناتا ہے)

سوئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں سلائے کیوں،

خراٹے لینے لگتا ہے۔

اُستاد:۔ ~ شرع و آئین پہ مدار سہی

ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

۱۱

یکم ستمبر ۱۹۴۹ء

(نئی دہلی میں پارلیمنٹ کی عمارت کے سامنے موٹروں کے احاطے کے اندر بزمِ بے تکلف کا نقشہ جما ہوا ہے۔ دوب کے نرم اور سبز فرش پر آنریبل ممبروں کے ہانکنے والے (ڈرائیور) چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بیٹھے یا لیٹے ہوئے گپ ہانک رہے ہیں۔ ایک چوکڑی جس میں ہر ایک الگ کھیت کا معلوم ہوتا ہے کسی اہم واقعہ پر اس قدر برجستہ رائے زنی کر رہی ہے کہ دُور سے دیکھنے والے کو لکدزنی کا شبہہ ہوتا ہے۔ آپ کا نامہ نگار زدسے باہر تخیل کے کان لگائے سُن رہا ہے۔ پارلیمنٹ کے اندر نئی مخالف پارٹی کا قیام موضوعِ بحث معلوم ہوتا ہے)

۱۔ ارے یار چھوڑ اس گل کو۔ نہ سٹھ نہ پنجہ۔ بارہ کی پارٹی کی تیر مار کے گی؟

ب :۔ ارماں کیا تھُڑدلی کی باتیں کرتے ہو۔ بارہ کیا کم ہوتے ہیں۔ ان کانگریس والوں کو ناکوں چنے نہ چبوا دیں تو میرا نام بدل دینا۔

ج :۔ تیرا نام بدلے پیچھے اپنے کو کیا مل جائیں گا؟ ہم بیٹ (شرط) کرنا منگتا۔

ب :۔ ابے تو تو سدا کا منگتا ہے، مگر یہاں کوئی داتا آنکھ کا اندھا گانٹھ کا پورا نہیں ملنے کا۔ گھڑ دوڑ میں بازی لگاتے لگاتے جوئے کا ایسا لپکا ہو گیا ہے کہ جب دیکھو شرط بدنے کو موجود اور یہاں بدکے پاس نہیں کھڑے ہوتے۔

د :۔ مگر تین سو ممبر کا شو مینے بارہ کیا کر سکتا؟ امی یہ نہیں شو مجھا۔

ب :۔ تمُمی آج تک کوئی بات سمجھا ہے جو یہ سمجھے گا۔ سچ کہتا ہوں۔ ایسے ایسے جانگلوؤں سے سابقہ پڑا ہے کہ جی چاہتا ہے کپڑے پھاڑ کر جنگل کی راہ لوں، بات کرنے کی تمیز نہیں ہے اور چلے ہیں سیاست میں ٹانگ اڑانے۔ ارے بھلے آدمیو، سجنو، ذرا کان کھول کے منہ پھیلا کے میری بات دھیان سے سُنو۔ یہ تو ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ بارہ آدمی چاہیے وہ سب کے سب سردار حکم سنگھ کی طرح تگڑے کیوں نہ ہوں۔ تین سو کو کشتی میں نہیں ہرا سکتے اور پھر یہاں تو ان بارہ میں ہمارے پروفیسر کے ٹی شاہ اور مولانا حسرت موہانی جیسے سینکیا پہلوان ہیں جن سے اپنا لنگر آپ نہیں سنبھلتا۔ مگر اس گول اکھاڑے کے اندر جسے اسمبلی کہتے ہیں کچھ ہاتھ پاؤں یا تیر تلوار کی لڑائی

تھوڑی ہوتی ہے یہاں تو زبان کی کاٹ کا مقابلہ ہوتا ہے اور اس میں ہمارے یہ دونوں بوڑھے ساونت کسی سے کم نہیں۔ ویسے تو پالا کانگریس والوں کے ہاتھ ہے اور جب تک دوسرے انھیں چناؤ میں چیت نہ کرلیں، راج پربندھ میں ان ہی کی چلتی رہے گی، پر جنتا راج کا قاعدہ ہے کہ ایک مخالف دَل ہونا چاہئے۔ جو حکومت والوں کو جھاڑتا اور جھنجھوڑتا رہے، نہیں تو طاقت کا نشہ ایسا بُرا ہوتا ہے کہ اچھے بھلے آدمی کی مت ماری جاتی ہے۔ اب تک تو یہ تھا کہ اکّا دُکّا کسی نے حکومت کو ٹوکا بھی تو نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سُنتا تھا۔ پر اب بارہ توتے مل کر ٹیں ٹیں کریں گے تو نقارچیوں کے کان تک بھی کچھ نہ کچھ آواز پہنچ ہی جائے گی کہو کچھ آیا سمجھ میں؟

ا :۔ آہو۔ سا لو سمجھ آگئی۔

ب :۔ بڑی جلدی آئی۔ تم کہو ماسٹر؟

ج :۔ برابر بات ہے؟

ب :۔ ہے نہ بالکل چوہرس؟ اور تم بابو؟

د :۔ امی کھوب شومجھ گیا۔

ب :۔ بوش، پھر کیا ہے! تم شب کو شومجھا دو۔

۱۲

۱۶ ستمبر ۱۹۴۹ء

"کہئے میر صاحب یہ جو ہندسوں کی لڑائی ہو رہی ہے۔ اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"ہندسوں کی لڑائی یعنی چہ؟ کیا خدا نہ کرے بی اکائی اور بی دہائی میں ہاتھا پائی کی نوبت آگئی یا طاق اور جفت میں گتھم گتھا کی ٹھہری؟"

"اجی قبلہ آپ کس دنیا میں رہتے ہیں؟ آئین ساز اسمبلی سے لیکر اخباروں کے صفحوں تک مہابھارت کا یدھ چھڑا ہوا ہے اور آپ کو خبر ہی نہیں۔ یوں تو قومی زبان پہلے ہی سے بتیس دانتوں میں زبان سی بنی ہوئی تھی۔ مگر جب سے ہندسوں کے متعلق آئینگر منشی فارمولا ——————"

"ذرا ٹھہرئے گا۔ یہ فارمولا کہیں بارہ مولا کے قریب رہتے ہیں؟"

"معاف کیجئے گا، میں آپ کو انگریزی داں سمجھتا تھا؟"

"خیر ہم انگریزی داں نہیں تو ہم کچھ ایسے مدان بھی نہیں ہیں، مگر ان حضرت فارمولا سے کبھی ملاقات کا اتفاق نہیں ہوا؟"

"فارمولا تجویز کو کہتے ہیں۔ آپ نے کرپس فارمولا تو سُنا ہوگا۔"

"اچھا یہ وہ بزرگ ہیں۔ سُننے کی آپ نے ایک ہی کہی، ان کو تو آج تک بھگت رہے ہیں اور کرپ کی جان کو دعائیں دے رہے ہیں مگر یہ کرپ ہے بلا کا آدمی، اب کی ہندسوں میں چار سو بیس کا فارمولا نکال دیا۔"

"نہیں میر صاحب کرپس سے کیا واسطہ؟ یہ تجویز تو سری منشی اور شری آئینگر کی ہے کہ قومی زبان میں وہی ہندسے استعمال کئے جائیں جو انگریزی میں اور دنیا کی بہت سی زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں مگر ہمارے ٹنڈن جی اڑے ہوئے ہیں کہ نہیں ہندسے بھی دیوناگری کے ہوں۔"

"ارے میاں ان باتوں میں کیا رکھا ہے، کیوں خواہ مخواہ تین پانچ کرتے ہیں؟ وہ ناگری دیو کے ہندسے ہوئے تو کیا اور سفید دیو کے ہوئے تو کیا؟

"ان کا کہنا ہے کہ ہندی عبارت کے بیچ میں انگریزی ہندسے اچھے نہیں لگیں گے۔"

"اچھے کیوں نہیں لگیں گے، ان سے کہئے کہ اگر آپ کے نام بڑا سا منی آرڈر آئے اور اس میں رقم انگریزی ہندسوں میں لکھی ہوئی ہو تو آپ کو ان ہندسوں پر پیار آئے گا یا نہیں؟ لیکن انکم ٹیکس کی رقم دیوناگری کیا دیو بانی ہندسوں میں بھی لکھی ہوئی ہو تو ایک ایک ہندسہ کانٹا بن کر آنکھوں میں کھٹکے گا۔ یہ ہندی، انگریزی کا نہیں لیکھے جوکھے کا معاملہ ہے۔"

"ٹنڈن جی یہ بھی کہتے ہیں کہ بدیسی چیز کو قومی زبان میں کیوں خواہ مخواہ ٹھونسا جائے۔ ایک تو انگریزی کے ہندسے، دوسرے عرب سے گئے ہوئے اور عربی کہلانے والے۔ بہ قول شخصے ایک تو کریلا کڑوا دوسرے نیم چڑھا۔"

"ہونہہ! جو کریلا عمر بھر کھاتے چلے آئے ہیں۔ اس میں اب کون سے

کیڑے پڑ گئے ہیں، رہا نیم سوٹیم کا کیا کہنا، بس ایک بار آنکھیں بند کر کے نگل جائیے۔ یہ آپ کا سارا فسادِ خون دُور نہ ہو جائے تو کہئے گا۔ آخر منشی جی کیا کہتے ہیں؟"

"وہ کہتے ہیں کہ یہ ہندسے بدیسی نہیں۔ ہندوستان سے عرب گئے تھے، اور وہاں سے دوسرے ملکوں میں پھیلے۔"

"بالکل ٹھیک کہتے ہیں، اگر ہندسے نہ گئے ہوتے تو ہندسے کیوں کہلاتے۔"

"سبحان اللہ میر صاحب، یہ دلیل کسی کو نہیں سوجھی تھی۔ بس اب منشی جی نے پالا مار لیا۔"

"اچھا یہ تو بتائیے آئنگر صاحب کیا فرماتے ہیں۔"

"ان کا استدلال یہ ہے کہ جنوبی ہند کی چاروں زبانوں میں سو سال سے یہ انگریزی یا بین الاقوامی ہندسے استعمال ہو رہے ہیں۔ جنوب والے آپ کی خاطر ہندی کو مان رہے ہیں۔ آپ اُن کی خاطر کم سے کم ان ہندسوں ہی کو مان لیجئے۔"

"خیر بھئی کچھ بھی ہو اب کی ٹنڈن جی کو بالا بے ڈھب حریفوں سے پڑا ہے، یہ چودھری خلیق الزماں نہ باشد کہ ہندی کا حملہ ہوا تو جوشِ شجاعت میں فراری جہاد فرما گئے۔ چاروں جنوبی زبانوں کے نمائندے اور پانچویں منشی جی مل کر جھپٹ گئے تو ٹنڈن جی کے چھکے چھڑا دیں گے۔ یہ میں آپ سے کہے دیتا ہوں۔"

۱۳

یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء

"ٹھہریئے، ٹھہریئے میر صاحب زرا بات تو سنیئے۔ آپ تو ایسے اُڑے چلے جا رہے ہیں جیسے ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوں"۔

"اماں کیوں راہ کھوٹی کرتے ہو، بہت دُور جانا ہے۔ خدا خدا کرکے آج پانچویں دن تو گھر سے قدم نکالنے کی نوبت آئی ہے۔ یہاں تلووں سے لگی ہے، کہ کسی طرح اخبار کے دفتر میں پہنچ کر چار دن کا فاقہ توڑیں۔ اور آپ ہیں کہ وقف لازم کی طرح بیچ میں روکنے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں"۔

"تو کیا آپ کے محلے میں بھی کرفیو تھا؟ وہاں تو شاید ان دنوں کوئی فساد نہیں ہوا"۔

"یہ "شاید" کی اور" ان دنوں" کی بھی ایک ہی رہی۔ اے حضت یہ بالکل قطعی حتمی یقینی امر ہے کہ جب سے دنیا کے پردے پر لکھنؤ کا شہر آباد ہوا ہمارے محلّے میں فسادِ خون اور ہاضمے کے فساد کے سوا اور کسی فساد کا آج تک نام بھی سُننے میں نہیں آیا۔ مگر وہ کہتے ہیں نا کہ کر تو کرفیو اور نہ کر تو کرفیو ——————"

"میر صاحب اگر مثل میں تصرف کرنا ہے تو پھر یوں کہئے، کر تو کرفیو اور نہ کر توڑ کرفیو۔ بہر حال یہ سُن کر سخت قلق ہوا کہ آپ نے پورے چار روز سے کچھ نہیں کھایا۔ اب آپ اتنی دُور زحمت کیوں فرمایئں جو کچھ نان دنمک

موجود ہے ——————"

"لاحول ولا قوۃ، تم بھی عجیب گھامڑ ہو۔ تم سمجھے کہ میں پیٹ کے فاقے کا ذکر کر رہا ہوں۔ اتنا بھی نہ سوچا کہ روٹی کی بھوک ہوتی تو اخبار کے دفتر میں جاکر کیا ایڈیٹر کا سر کھاتا۔ ارے بھئی اس چار روز میں اور تو جو کچھ گذری گذر گئی مگر اخبار کی ہڑک نے وہ حال کر دیا جو افیمی کا عمل کے بغیر ہو جایا کرتا ہے طبیعت کند، جی نڈھال، بدن ٹوٹ رہا ہے۔ جمائیاں آرہی ہیں۔ آج چھوٹتے ہی آس پاس کے سارے اڈے جہاں اخبار بکتا تھا دیکھ ڈالے، مگر ایک اخبار بھی نظر نہ آیا۔ خدا جانے جیتے بچے یا سب کو کرفیو سونگھ گیا۔ ناچار یہ سوچا کہ چلو بھئی جہاں تازے تازے گرم گرم اخبار تنور سے پک کر نکلتے ہیں، وہاں چلیں۔ کچھ بنگالے کام روپ کا حال تو معلوم ہو، فساد کا یہ سفلی جادو وہیں سے چلا ہے جب تک وہاں نہ روکا جائے۔ یہاں کسی طرح نہیں رک سکتا لوگوں کی کچھ ایسی مت ماری گئی ہے کہ کہیں کا بدلہ کہیں چکاتے ہیں۔ کوئی پوچھے۔ "کرے داڑھی والا اور پکڑا جائے مونچھوں والا" یہ کہاں کا انصاف ہے مگر صاحب وہ تو جادو کا پھیر ہے اس میں انصاف اور عقل کا کیا کام۔ اب نہ جانے اس چار روز میں ——————"

"میر صاحب اتنا تو میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ بنگال کی حالت کچھ سدھر گئی ہے۔ پچھلے چند روز میں کوئی بڑا واقعہ نہیں ہوا، مگر سب سے اہم خبر یہ ہے کہ لیاقت علی خاں صاحب پنڈت نہرو سے بنگال کے معاملے میں اور دوسری چیزوں کے بارے میں گفتگو کرنے کے لئے دہلی آرہے ہیں۔"

"اے تو جیتا رہے، تیرے منہ میں گھی شکر، کیا خبر سنائی ہے کہ جی خوش کر دیا۔ بس اب اللہ نے چاہا تو بیڑا پار ہے۔"

"مگر میر صاحب اتنی زیادہ اُمید نہ باندھیے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک تو سمجھوتا ہونا مشکل ہے، اور ہو بھی جائے تو کیا خبر اس کا بھی وہی حشر ہو جو پہلے سمجھوتوں کا ہوا۔"

"لوگ جھک مارتے ہیں، ہم تمھیں ایک موٹی سی بات بتاتے ہیں اس کو سمجھ لو، اب رہیں اس کی باریکیاں، ان کو تم خود سوچتے رہنا۔ اگر دو سیاسی پہلوان جٹ لنگوٹ کس کر خم ٹھونک کر ایک دوسرے سے گتھ جانے کو تیار ہوں مگر عین وقت پہ ہاتھ ملاتے ہی گلے مل جائیں اور ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی جگہ پچکارنے لگیں تو اسے سیاست کی چال نہیں ستاروں کی چال سمجھو۔ گرم کھولتا ہوا خون ایک دم سے ٹھنڈا پڑ جائے تو جان لو کہ یہ طبیب کی مسکن گولی کا نہیں طبیعت کے استحالے کا کرشمہ ہے اگر وہ تناتنی جو سوا دو برس سے چلی آتی تھی۔ ایکا ایکی ڈھیلی پڑ گئی تو خدا کا شکر کرو کہ بحران ختم ہوا اور مریض بچ گیا۔ اب طبیعت رفتہ رفتہ سنبھلتی چلی جائے گی۔"

۱۴

۸ر نومبر ۱۹۳۹ء

(شام اور وہ بھی بمبئی کی شام، سارا مغربی ساحل والکیشور سے قلابہ

تک بجلی کے قمقموں سے جگمگا رہا ہے۔ بہ قول شخصے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سمندر کی ملکہ کے گلے میں گھر ہائے پشب چراغ کا نولکھا ہار پڑا دمک رہا ہو میرین ڈرائیو میں سمندر کے کنارے ایک اور جیتا جاگتا، چلتا پھرتا، ہنستا کھیلتا سمندر موجیں مار رہا ہے۔ اس ساگر کے بیچ میں کہیں کہیں پر بنچیں ساکن کشتیوں کی طرح بے چین پڑی ہوئی ہیں، یہ دیکھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں کہ ایک بنچ پر ایک ادھیڑ عمر کا انگریز (ا) ایک نوجوان ہندوستانی (ب) سے گھُل مل کے باتیں کر رہا ہے۔ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیئیں۔ خدا کی شان نہیں تو اور کیا ہے؟)

ب :۔ اچھا تو آپ دو برس بعد صرف یہ دیکھنے کے لئے یہاں تشریف لائے تھے کہ آپ کے پیچھے ہمارا کیا حال ہے۔ پھر آپ نے کیا دیکھا؟ یہی نا کہ ہندوستان آپ کے فراق میں تڑپ رہا ہے؟

ا :۔ خیر ہمارے فراق میں تو کیا مگر کچھ بے چین آپ کا ملک ضرور معلوم ہوتا ہے۔

ب :۔ کچھ بے چین؟ یہ نہیں کہتے کہ ماہئی بے آب ہو رہا ہے۔ مگر قبلہ گورے صاحب اس بے چینی کی وجہ ہجر کی آگ نہیں پیٹ کی ہوک ہے۔ اس چیز سے آپ واقف نہیں، اس کا مزا تو ہمیں خوب جانتے ہیں۔

ا :۔ اجی یہ نہ کہئے۔ وہ دن گئے جب ہماری پانچوں گھی میں تھیں اور سر کڑھائی میں۔ اب تو ہمیں بھی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو رہا ہے۔ مگر

معاف کیجئے گا میرا تو یہ خیال ہے کہ آپ جس درد سے تڑپ رہے ہیں
وہ خالی پیٹ کا نہیں بدہضمی کا درد ہے بات یہ ہے کہ آزادی کو
آپ نگل تو گئے مگر وہ ابھی پچنے نہیں پائی۔

ب :۔ واہ رہی آپ کی جمہوریت! آپ کے سیاسی فلسفی تو یہ کہتے کہتے
مر گئے کہ آزادی انسان کے لئے ماں کا دودھ ہے اور آپ
اسے ماش کی دال سمجھتے ہیں جو کسی طرح ہضم ہی نہ ہو۔

ا :۔ میاں صاحب زادے جن بچوں کا ہاضمہ کمزور ہوتا ہے انھیں ماں
کا دودھ بھی ہضم نہیں ہوتا، اوپر کا دودھ پلانا پڑتا ہے۔

ب :۔ تب ہی آپ اس بچارے بچے کو اتنے دن تک اوپر کا دودھ پانی
ملا کر چسنی سے پلاتے رہے، خیر اب تو آپ اسے ماں کے نرل دودھ
کا چسکا لگ گیا ہے۔ اب بی آنا لاکھ چاہیں وہ بوتل کا دودھ پینے
کو ان کی گود میں نہیں آنے کا۔

ا :۔ (ہنس کر) آپ اطمینان رکھیئے۔ بی آنا کو اپنے ہی پوت کا پالنا
مشکل ہو گیا۔ پرائے بچہ کو وہ کیا کھا کے پالیں گی۔ میں تو آپ کو
صرف یہ جتانا چاہتا ہوں کہ بوتل کے دودھ سے لگے ہوئے
بچے کو ایک دم سے ماں کا دودھ ملنے لگے تو ظاہر ہے کہ اس
کا پیٹ بھی دکھے گا۔ ہاتھ پاؤں بھی ٹپکے گا۔ دودھ بھی ڈالے گا۔
آپ کو ان باتوں سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔

ع عادت پڑنا سہل نہیں ہے پڑتے پڑتے پڑتی ہے

ب :۔ مگر بچہ روز بروز سوکھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اس کا کیا علاج ہے؟
ا :۔ یہ تھوڑے دن کی بات ہے۔ آزادی کی غذا جہاں پچنے لگی بس امرت کا کام دیتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے رگوں میں خون، ہڈیوں میں رس، پٹھوں میں کس، بازوؤں میں بل، آنکھوں میں چمک، چہرے پر رنگ آجاتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ آزادی اصلی ہو، بناسپتی نہ ہو۔
ب :۔ آپ کے خیال میں ہماری آزادی اصلی ہے یا نقلی ہے؟
ا :۔ (ہنس کر) اب یہ بھی مجھ سے پوچھئے گا۔ دیکھئے آپ کو ایک گر کی بات بتاتا ہوں۔ اصلی آزادی ذہن کی آزادی ہے، اور اس کی ایک ہی پہچان ہے، اپنے آپ پر بھروسہ ——— اپنی رائے پر، اپنی طاقت پر، اپنی کمزوری پر، اپنی عقل پر، اپنی حماقت پر۔

۱۵

یکم مئی ۱۹۵۰ء

"بھئی واہ میر صاحب، آپ نے تو اخبار چیوں کا نام بھی ڈبو دیا۔ صبح سے اخبار کا شغل ہو رہا ہے، خبروں کو گھول گھول کر چسکی لیجا رہی ہے اور جو مزے کی خبر ہے آپ نے چھوڑ ہی دی۔"
"تمھارے کہنے سے چھوڑ دی۔ آئے وہاں سے بڑے اخبار کے پڑھیا بن کے! یہاں ایسی منجھی ہوئی نظریں ہیں کہ کیا مجال کوئی چٹ پٹی چیز بچکر

نکل جائے۔ آخر تم کس خبر کا ذکر کر رہے ہو؟ وہ چین کا ٹی شیک والی؟"

"توبہ توبہ! آپ نے بھی کس پچھڑی ہوئی ہڈی کا نام لے دیا۔ بھلا اب اس میں کیا مزا رہا ہے۔ میرا اشارہ ایسی خبر کی طرف ہے کہ اگر آپ دیکھ پاتے تو بقول حضرت جگر رقص فرمانے لگتے۔"

"یا الہٰی وہ کون سی خبر ہے جو ڈگڈگی کا کام دیتی ہے۔ آخر کچھ بتاؤ گے بھی یا یوں ہی جھکائیاں دیتے رہو گے؟"

"اچھا تو پھر سنیئے۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ راویان ہزار داستاں اس طرح رطب اللساں ہیں کہ امریکہ میں ایک اعصابی گیس ایجاد ہوئی ہے یا ہونے والی ہے جس کی یہ خاصیت ہے کہ جہاں آپ نے حقہ عیاری میں بھر کر حریف پر چھوڑی، اس کا جی چھوٹ جاتا ہے، کس بل نکل جاتا ہے اور کچھ ایسا مرنجان مرنج چہ خفتہ چہ بیدار ہو کر رہ جاتا ہے کہ لڑائی کا نام تک نہیں لیتا۔ اب فرمایئے یہ خبر آپ نے پڑھی تھی؟"

"لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ بس یہی تھی آپ کی سنسنی خیز، ولولہ انگیز ناچنے اور نچانے والی خبر۔ سچ کہتا ہوں تمھاری تو امریکہ کے موہ میں مت ماری گئی ہے۔ غضب خدا کا ہمارے یہاں کی ایک معمولی چیز جسے بچہ بچہ جانتا ہے۔ نئی دنیا میں جا کر نئی ایجاد بن گئی اور آپ ہیں کہ امریکہ کی ستم ایجادی پر سر دھن رہے ہیں۔ ع

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو"

"چلئے چھٹی ہوئی۔ دنیا کے سائنس داں لاکھ عقل لڑائیں، آسمان

میں ٹھگلی لگائیں مگر کیا مجال کہ ان کی اینچ ہمارے چنڈو خانے کی گپک کا مقابلہ کرے۔ کیوں صاحب وہ اعصابی گیس کے جوڑ کی چیز ہمارے ہاں کون سے عمل میں تیار ہوتی ہے۔"

"جی اسی چنڈو خانے میں جس کا آپ اس حقارت سے ذکر کر رہے ہیں۔ ارے بندۂ خدا کبھی مدک کا نام بھی سنا ہے۔ جس کی شان میں شاعر کہتا ہے ؎

کھو دیا حسن مدک نے ستم ایجادوں کا
اُڑ گیا رنگ دھواں بنکے پری زادوں کا

دیکھو خدا لگتی کہنا جو جو صفتیں تم نے اس نئی ایجاد میں بتائیں ان میں سے ایک ایک جھنیا بیگم کی اس خام پارہ بیٹی میں موجود ہے یا نہیں۔ اب امریکہ نے اس کا نام اعصابی گیس رکھ لیا تو کون سا تیر مارا۔"

"بھئی کیا کہنا ہے، میر صاحب آپ کا دم بھی غنیمت ہے۔ ہوا باندھنا کوئی آپ سے سیکھے۔ مگر حضرت یہ تو بتائیے کہ مدک کا عمل تو پینے سے ہوتا ہے وہ اعصابی گیس کا کام کیسے دے سکتی ہے؟"

"تم بڑے سائنس داں کی دم بنتے ہو اور ایسی کچی بات منہ سے نکالتے ہو۔ کبھی تجربہ کر کے دیکھا ہے کہ مدک کی دھونی کا کیا اثر ہوتا ہے؟"

قبلہ یہاں پر تو ہم بھی قائل ہو گئے مگر آپ ایک کام کیجئے۔ اپنی اس اُپج کو شانتی گیس کے نام سے پیٹنٹ کرا لیجئے اور ان سیٹھ صاحب

سے مل کر جو جنگ کے کاروبار میں روپیہ بٹورنے کے بعد اب صلح کا کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔ ایک فیکٹری کھول دیجئے۔ بس پھر کروڑوں روپیہ کے وارے نیارے ہیں۔"

"تم نے بھی کمال کر دیا، بھلا ہمارا سیٹھ شانتی گیس کا کارخانہ کھولنے کی زحمت اُٹھائے گا یا آرام سے گھر بیٹھ کر فلک سیر اور شراب کی چور بازاری کرے گا۔ سُنا نہیں کہ بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا ادھر بمبئی کی حکومت نے نشہ بندی کی ادھر ہمارے سیٹھ جی نے نشہ کشائی شروع کر دی۔

قید کی حد میں بڑھا لی ہم نے آزادی کی حد
یوں دیئے جھٹکے کہ حلقے کھنچ گئے زنجیر کے

(ب)

ا

۲۴ر جون ۱۹۴۸ء

ا :۔ اے حضرت یہ ہٹلر کا کیا قصہ ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کی ساری چنگیز خانی ایک بیماری کی وجہ سے تھی۔ اس بیماری کا نام بھی کچھ عجیب سا بتاتے ہیں، احساس کم تری! خدا جیتا رکھے۔ بچوں کی ماں کو ان کی بدولت بھانت بھانت کی بیماریاں اپنے گھر ہی میں دیکھ ڈالیں۔ مگر یہ بیماری کبھی دیکھی نہ سُنی۔

ب :۔ آپ کے ہوتے ہوتے یہ بیماری آپ کی بیوی کو نہیں ہو سکتی۔ یہ کوئی سماجی بیماری نہیں نفسی علّت ہے۔

ا :۔ جی کیا فرمایا کون سی علّت؟

ب :۔ نفسی، نفس سے تعلق رکھنے والی۔

ا :۔ اچھا اب سمجھا! نفس امارہ۔ بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گرمارا۔

ب :۔ جی ہاں یہی نفس امارہ۔ اگر بچپن میں زیادہ پٹ جائے تو نوجوانی میں اس میں احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔

ا :۔ وہی ہٹلر والا مرض؟ مگر یہ تو بتایئے اس میں ہوتا کیا ہے؟

ب :۔ بس یہی ہوتا ہے کہ بچپن میں کسی وقت زیادہ پٹ جانے سے نفس چوٹ کھا جاتا ہے اور تلملاتا رہتا ہے کہ دوسروں کو دھمکا کر، دبا کر ستا کر ان کو اور اپنے آپ کو اپنی طاقت اور برتری کا یقین دلائے۔

ا :۔ مگر سنئے تو کمزور مار کھانے کی نشانی بھلا دوسروں کو کیا دھمکائے گا اور ستائے گا۔

ب :۔ ایسا آدمی جسمانی اور اخلاقی حیثیت سے تو کمزور ہوتا ہے، مگر اس کے گلے میں اور پھیپھڑوں میں بلا کا زور ہوتا ہے۔ نعرے لگاتا ہے تو زمین ہل جاتی ہے۔ لوگ آ کر اس کے آس پاس جمع ہو جاتے ہیں،

ا :۔ ہنستے ہوں گے اس کے ہولوپن پر۔

ب :۔ شروع میں ہنستے ہیں مگر وہ انھیں وردیاں پہناتا ہے۔ ہتھیار دیتا ہے۔ قواعد کراتا ہے۔ نعرے لگواتا ہے یہ سب باتیں وہ دل لگی سمجھ کر کرتے ہیں مگر ہوتے ہوتے ان پر ایک نشے کی سی بلکہ جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ہٹلر کے جوش خطابت سے انھیں جوش آتا ہے۔ اُن کے جوش سے ہٹلر کا جوش اور بڑھتا ہے

ایک چکر سا بندھ جاتا ہے۔

ا:۔ پھر کیا ہوتا ہے؟

ب:۔ وہ ڈھونڈھ کر کمزوروں کو دھمکاتے ہیں۔ ستاتے ہیں اور فتح کے نعرے لگاتے ہیں۔ ہٹلر کی دکھتی ہوئی چوٹ کو ذرا تسکین ہوتی ہے مگر پھر اس کی تپک اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ وہ اور زیادہ چیختا ہے چلاتا ہے، نعرے لگاتا ہے۔ کمزوروں کو اور زیادہ دھمکاتا اور ستاتا ہے۔

ا:۔ آخر اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

ب:۔ وہی جو ہٹلر کا ہوا۔

ا:۔ بھئی واہ آپ نے تو خوب خوب باتیں بتائیں۔ کیوں حضرت یہ کون سی بدیا ہے؟

ب:۔ اسے تحلیل نفسی کہتے ہیں

ا:۔ اچھا وہی نفسی علت، یہ آپ کو کیسے لگ گئی۔

ب:۔ (غصے میں چیخ کر) آپ تو بڑے احمق ہیں۔

ا:۔ الٰہی خیر۔ وہ کیا کہلاتی ہے۔ کمتری؟ معلوم ہوتا ہے اسی کا دورہ پڑ گیا۔ اب بندہ یہاں سے کھسکتا ہے۔

۲

۸ رجولائی ۱۹۴۸ء

اللہ بخشے بھولے صاحب ایک ہندوستانی ریاست میں جج تھے۔ یہ عہدہ انھیں قانون دانی کے جرم میں نہیں بلکہ دامادی کے صلے میں دیا گیا تھا۔ ان کی شادی والیٔ ریاست کے ایک قریبی عزیز کی لڑکی سے ہوئی تھی اور وہ سرکاری داماد مشہور تھے۔ موٹے آدمی تھے۔ سر چھوٹا تھا اور خود بخود ایک خاص تال سے دائیں بائیں ہلتا رہتا تھا۔ لوگ اسے میزان عدالت کا کانٹا کہتے تھے۔

بھولے صاحب ججی کی تنخواہ سے تو بہت خوش تھے مگر کام سے نالاں تھے۔ خاص شکایت انھیں یہ تھی کہ ہر مقدمہ میں ایک فریق کچھ کہتا ہے۔ دوسرا کچھ کہتا ہے اور دونوں اپنے گواہ پیش کر دیتے ہیں۔ اب آدمی کس کی بات مانے کس کی نہ مانے۔ پھر وکیل اور دونوں کی طرف سے دلیلیں پیش کر کے چکر میں ڈال دیتے ہیں۔ کبھی کبھی فریقین کے بیانات یا وکیلوں کی بحث سُنتے سُنتے بڑی معصومیت سے کہتے "اے بھئی دونوں سچ سچ بتا دو نا کہ معاملہ کیا ہے کیوں خواہ مخواہ دق کرتے ہو؟"

آج کل بین الاقوامی معاملات کا اندازہ کرنے میں اکثر لوگوں کا وہی حال ہوتا ہے جو بھولے صاحب کا مقدمات کا فیصلہ کرنے میں ہوتا تھا۔ ان خوش اعتقاد جنتی لوگوں کا تو ذکر ہی نہیں، جن کی سادہ لوحی بھولے صاحب کے

بھولے پن کو بھی مات کرتی ہے، جو ٹروہین کی سچائی کا کلمہ پڑھتے ہیں یا اسٹالن کی حق گوئی کا لوہا مانتے ہیں۔ لیکن ہم جیسوں کے لئے جو دونوں کے دروغ مصلحت آمیز کو چھان کر اس میں سے راستی فتنہ انگیز کے چھوٹے چھوٹے ریزے نکالنا چاہتے ہیں۔ بڑی مشکل ہے۔ اصول اور رائے تو ایک طرف، یہاں تو واقعات کے متعلق ایک دوسرے کی ضد میں ایسے بیانات دیئے جاتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔

"جنوبی کوریا میں روسیوں کی سازش پکڑی گئی۔ وہ نل کے پانی میں کمیونزم کا زہر گھول کر کوریا کے غریب باشندوں کو پلانا چاہتے تھے۔"

"جنوبی کوریا میں امریکیوں نے جمہوریت کی بھنگ مٹھائی میں ملاکر بیچارے کوریا والوں کو کھلا دی۔"

"یونان کی سرحد پر بلغاریہ اور روس باغیوں کو مار مار کر یونان کی جائز حکومت سے لڑوا رہے ہیں۔ باغی بُری طرح پٹ رہے ہیں اور بدحواسی میں یونان کے اندر گھس کر لڑکوں کو پکڑے جاتے ہیں۔"

"یونان میں محبانِ وطن انگلستان اور امریکہ کے پٹھوؤں سے، جنھوں نے حکومت غصب کرلی ہے۔ جان توڑ کر لڑ رہے ہیں اور ناکوں چنے چبوا رہے ہیں۔ لڑکوں کو پکڑ کرلے جانے کا الزام غلط ہے۔ اول تو یونانی لڑکے بلغاریہ میں ہیں نہیں اور اگر ہیں تو خود ہی کبڈی کھیلتے ہوئے چلے آئے ہیں۔"

"برلن میں جو حصّہ انگریزوں اور امریکیوں کے قبضے میں ہے۔ اس کی

روسیوں نے ناکہ بندی کر دی ہے۔ بچارے جرمن فاقہ کر رہے ہیں (کیونکہ؟) سینکڑوں امریکی ہوائی جہاز روزانہ اُن کے لئے غذا کا سامان لا رہے ہیں"۔

"برلن کی ناکہ بندی کا الزام بالکل بے بنیاد ہے۔ بات یہ ہے کہ برلن کے آس پاس کی ریلوے لائینوں کے لاک اسٹالین کا نام لینے سے کھلتے ہیں۔ انگریزی اور امریکی ریلیوں کے انجن مقررہ آداب کو بجا لانے کے بجائے سیٹی بجاتے ہیں۔ قفل اس کو توہین سمجھ کر بگڑ جاتے ہیں"۔

اب آپ ہی بتائیے کہ یہاں ہندوستان میں بیٹھ کر کوئی کیسے کہے کہ ان متضاد بیانات میں سے کون سا صحیح ہے۔ بہت دن سوچنے کے بعد میں نے اب یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے خوش عقیدہ دوستوں کی طرح دونوں میں سے ایک کی بات پر آنکھ بند کر کے اعتبار کر لوں مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس پر کروں۔

اکبر کی مشکل یہ تھی۔ ع

غصہ آتا ہے مجھے اکثر مگر کس پر کروں

اور میری مشکل یہ ہے ع

اعتبار آتا تو ہے مجھ کو مگر کس پر کروں

۳

۸ رفروری ۱۹۴۹ء

"میں کہتی ہوں آخر تم کب تک بیٹھے اونگھتے رہو گے۔ اس موئے اخبا

میں شاید افیم گھلی ہوئی ہوتی ہے۔ پہروں بیٹھے چسکی لیتے رہتے ہیں، اور اس کے بعد پھر پینک کا زور ہوتا ہے۔"

"واہ ری تقدیر کیا قدردان بیوی ملی ہے! اری نیک بخت، یہ پینک نہیں فکر ہے فکر۔ غواص طبع دریائے فکر میں غوطہ لگاتا ہے اور دور کی کوڑی لاتا ہے۔"

"ہم نے تو کبھی پھوٹی کوڑی بھی نہ دیکھی۔ اور فکر کی خوب کہی! ایسے بے فکرے تو میں جانوں کہیں دنیا میں نہ ہوں گے۔ بس دو گھنٹے جا کر لڑکوں کو الٹا سیدھا سبق پڑھا دیا اور دن بھر کو چھٹی۔"

"جہالت بھی بہار بے خزاں ہے۔ ہم علمی فکر کا ذکر کر رہے ہیں اور یہ تردد اور پریشانی سمجھ رہی ہیں۔ مگر سچ پوچھو تو پریشانی بھی کچھ کم نہیں۔ ادھر چیانگ کائی شک چل دیئے اور سن فو کا چل چلاؤ ہے۔ ادھر تھاکن تو اور اور ٹن ٹٹ کی حکومت ڈانواڈول ہے۔"

"کیا اوٹ پٹانگ بک رہے ہو آخر دشمنوں کو کاہے کی پریشانی ہے۔ کوئی ڈھنگ کی بات کہو تو سمجھ میں آئے۔"

"ڈھنگ کی بات ہو تو کہوں۔ دنیا کی رفتار ہی بے ڈھنگی ہے۔ جدھر دیکھو فتنہ و فساد ہے۔ خانہ جنگی ہے۔ یہودی اور مصری، ولندیزی اور انڈونیشی ایک دوسرے کی جان کے خواہاں ہیں۔ یونان، برما اور چین کے لوگ آپس ہی میں دست و گریباں ہیں۔

ایں چہ شوریست کہ در دورِ قمر می بینم ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم"

"یہ تمھیں تک بندی کا کیا مرض ہے۔ جیسے کوئی داستان کہہ رہا ہو، وہی افیمیوں کی سی عادت، اور پھر میں کہتی ہوں تو بُرا مانتے ہو۔ آخر ان فکروں میں کیوں گھلے جاتے ہو؟ یہ تو دنیا ہے۔ باوا آدم کے وقت سے یوں ہی چلی آئی ہے اور یوں ہی چلی جائے گی۔"

"اب تمہیں کیسے سمجھاؤں؟ وینڈل ولکی نے کہا ہے کہ دنیا ایک ہے۔"

"اس کا سرا ایک کیسے ہے؟ دو ہیں۔ ایک دنیا کہلاتی ہے دوسری آخرت۔"

"اری عقل مند آخرت کا یہاں کیا ذکر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ساری دنیا ایک رشتے میں مربوط ہے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

ایک جگہ بدامنی ہو تو اس کی دھمک دور دور تک پہنچتی ہے۔ ہمسایہ ملکوں کی خانہ جنگیوں کا اثر ہندوستان پر پڑ گیا تو کیا ہوگا؟"

"لو اور سنو، ہندوستان میں جھگڑے فساد میں کچھ کسر رہ گئی ہے جو اب پوری ہوگی۔"

"وہ فرقہ واری آگ تھی جو بھڑک کر بجھ گئی میں طبقہ واری آگ کو کہہ رہا ہوں ——— جو ایک بار لگی تو پھر بجھنے کا نام نہیں لیتی۔"

"اے آگ لگے ان واریوں کو۔ تم نے تو دل دہلا دیا۔"

"اب سمجھیں کہ میں کس فکر میں رہتا ہوں؟"

"یہ تو سمجھی، مگر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ چارپائی پر بیٹھ کر اونگھنے سے کیا ہوگا۔ کسی کی سوکھی لکڑی کی ٹال ہو اور آگ بڑھتی ہوئی آرہی ہو تو وہ تمھاری طرح غوطے میں بیٹھا رہے گا یا پانی کے چھینٹے دے دے کر لکڑیوں کو گیلا کرے گا۔"

"یہ تو تم نے سچ کہا۔ مگر لکڑیاں بہت سوکھی ہیں چھینٹوں سے کام نہیں چلتا، دریا بہانے کی ضرورت ہے۔ ہماری حکومت بند باندھ کر نہریں نکالنے کے منصوبے تو باندھ رہی ہے، مگر وقت تھوڑا ہے اور کام بہت ہے۔"

"تو تم پلنگ کے بان توڑنے کی جگہ جا کر حکومت کا سر کھاؤ۔ چلو اُٹھو، میں بستر تہہ کر دوں۔ ابھی بہت کام پڑا ہے۔"

۴

۲۴ر فروری ۴۹ء

"ارے بھئی کچھ اور بھی سُنا۔ ٹیٹو دراصل ٹیٹو نہیں ہے۔"

"یا وحشت! ذرا سانس لیجئے، حواس درست کیجئے۔ یہ ٹیٹو کیا بلا ہے؟ کوئی ٹوٹکا ہے، ٹوٹم ہے؟

آخر ہے کیا؟"

"اجی وہی مارشل ٹیٹو۔"

"اچھا وہ! یوگوسلاویہ کا راج پرمکھ؟"

"راج پرمکھ کی ایک ہی کہی۔ وہی تو ایک سچ مچ کا ڈکٹیٹر ہے۔"

"تو یہ سچ مچ کا ڈکٹیٹر جھوٹ موٹ کا ٹیٹو ہے؟ وہ کیسے؟"

"ابھی اخبار کی خبر سُن کر آیا ہوں، ایک امریکی نامہ نگار نے پتہ چلایا ہے کہ ٹیٹو ٹیٹو نہیں ہے"

"امریکی نامہ نگار گھاس کھا گیا ہے۔ ساری منطق کا دار و مدار اس تضیئے پر ہے کہ الف الف ہے، بے بے ہے۔ تو پھر ٹیٹو ٹیٹو کیوں نہیں ہے"

"پوری بات تو سُن لو۔ کہنے والا کہتا ہے کہ اصلی ٹیٹو جرمنوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ یہ ایک روسی فوجی افسر ہے جو ٹیٹو بن بیٹھا ہے۔"

"کہنے والا جھوٹ بولا، مگر بولنا نہ آیا۔ امریکی افسر کہا ہوتا تو ایک بات بھی تھی۔ بھلا روسی افسر روس سے یوں ٹر ٹر کرتا جیسے یہ ڈکٹیٹر کرتا ہے؟ ہماری بلی اور ہمیں سے میاؤں؟"

"تمہیں تو منطق چڑ گئی ہے۔ صریحی واقعہ ہے کہ خود ٹیٹو کے قریبی عزیز اس شخص کو نہیں پہچانتے، اور صاف کہتے ہیں۔ یہ ہرگز ٹیٹو نہیں ہے اور تم ہو کہ خواہ مخواہ منطق چھانٹ رہے ہو۔"

"کاش میرا ایبل منطق پڑھا ہوتا! اے منکر ٹیٹو ذرا اپنے عقل کے ٹٹو کو ایڑ لگا اور اس بات پر غور کر۔ اگر یہ شخص بنا ہوا ٹیٹو ہوتا تو کس کس کو دھوکا دیتا اور کب تک دے سکتا؟ تمہارا وہ زیٹیا نامہ نگار کہتا ہے کہ ٹیٹو کے عزیز اسے نہیں پہچانتے، اس کے یہ معنی ہوئے کہ یا تو

اس کی شکل ٹیٹو سے نہیں ملتی یا اس کی حرکتیں، یا پھر دونوں ہی چیزوں میں وہ ٹیٹو نہیں بلکہ غیر ٹیٹو ہے۔ اب تمہیں بتاؤ کہ ٹیٹو پن کے بغیر ٹیٹو بن بیٹھنا کوئی ہنسی ٹھٹھا ہے۔"

"تمہاری ٹیں ٹیں سے تو جی گھبرا گیا۔ فرض کرو تمہیں ٹھیک کہتے ہو مگر آخر اس نامہ نگار کو جھوٹی خبر گھڑنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"قربان اس بھولے پن کے۔ حضرت کو آج تک یہی نہیں معلوم کہ اخبار والے جھوٹی خبریں کیوں گھڑتے ہیں۔ سنو، ایک اخبار نویس نے اس سوال کے جواب میں کہا ہے:۔

کبھی تن کی خاطر، کبھی وطن کی خاطر، کبھی من کی خاطر، کبھی انجمن کی خاطر اور کبھی محض فن کی خاطر۔"

"خدا پناہ میں رکھے اخبار والوں کے جھوٹ سے اور تمہارے سچ سے، ان کے بے تکے پن سے، اور تمہاری تک بندی سے۔"

۵

۸ مئی ۱۹۴۹ء

"کہئے بابو صاحب، مزاج تو اچھا ہے۔"

"خاک اچھا ہے۔ نزلے نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔"

"تو یوں کہئے قوام آج کل کچھ پتلا ہو رہا ہے۔

ع حضرت نزلہ ہیں صدر انجمن
دم بدم ان کی بھی اک تحریک ہے"
"جی اور تحریک کے ساتھ ہی باآواز بلند تائید بھی سرزد ہو جاتی ہے۔ چھینکتے چھینکتے ناک چھل گئی"
"خیر اس دردناک قصے کو چھوڑئے کچھ چین ماچین کا حال سنائیے شیخ صاحب کا آج کل کیا رنگ ہے؟ سنا تھا اپنے گاؤں میں چلہ کھینچ رہے ہیں۔
"معلوم ہوتا ہے آپ بھی چلے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ چیانگ کب کا میدان میں آچکا ہے اور آپ کو خبر ہی نہیں"
"بھئی غضب کر دیا ایسا نظر آتا ہے کہ اب قضا ہی آگئی ہے ایک بار تو اس موساتون نے پر نوچ کر چھوڑ دیا تھا۔ اب کی پائے گا۔ تو اُدھیڑ ہی ڈالے گا"
"اجی منہ دھو رکھئے ابھی وہ میاں تنگ کو ناکوں چنے چبوائیگا"
"بھئی ہم اس دھاندلی کے قائل نہیں، کشتی لڑو تو ڈھنگ سے لڑو۔ یہ کیا کہ حریف نے صاف چت کر دیا اور آپ ہیں کہ کسی طرح ہار نہیں مانتے۔ اکھاڑے میں لوٹے لوٹے پھر رہے ہیں"
بات یہ ہے کہ چین میں آن بڑی چیز سمجھی جاتی ہے۔ جان جائے پر آن نہ جائے"
مگر بابو صاحب جمہوریت کی آن کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ آخر چھ چلی

بھی تو اپنے وقت کا فرعون تھا۔ وزارت کی کرسی پہ اس شان سے بیٹھتا تھا جیسے عرش پہ بیٹھا ہو۔ مگر جب قوم نے کرسی سے اُتار دیا چپ چاپ اُتر گیا۔ دل پہ جو کچھ بھی گزری ہو مگر ماتھے پر شکن نہیں آنے دی کوئی صورت دیکھ کر کہہ نہیں سکتا کہ اُترا شخص چرچل نام یہی ہے۔ اسی ٹھاٹھ سے چرٹ منہ میں دبائے۔ دھواں اُڑاتا انگلیوں سے دو شاخہ دکھاتا پھرتا ہے۔ ایک ہمارے چینی شیخ ہیں کہ ہار ماننے میں ان کی آن جاتی ہے۔ بھئی ہم تو جمہوریت کے معنی یہی سمجھے ہیں کہ سیاست کا اور لڑائی کا کھیل قاعدے سے کھیلو۔ جیت کر اتراؤ نہیں، ہار کر روؤ نہیں۔"

"تو میر صاحب آپ جاکر سمجھائیے نہ؟"

"سمجھاؤں کیسے نہ تو مجھے چوں چوں آتی ہے نہ گٹ پٹ۔ ع

زبانِ یار من چینی و من چینی نہ می دانم

۶

یکم جولائی ۱۹۴۹ء

آداب بجا لاتا ہوں جناب ٹرومین صاحب! کہئے مزاج اچھے ہیں۔ جی میں جانتا ہوں کہ آپ مجھ سے واقف نہیں ہیں۔ مگر آپ اس کا کچھ خیال نہ کیجئے گا۔ واللہ مجھے ذرا بھی شکایت نہیں۔ اس لئے کہ میں ٹھہرا

گوشہ نشیں اور آپ چشم بد دور بالانشیں (مگر خدانخواستہ کم خرچ نہیں) بھلا مجھ پر گمنامی کی کال کوٹھری میں آپ کی نظر کیسے پڑتی اور میں آپ کو شہرت کے قصر سفید میں کیونکر نہ دیکھتا۔ یوں تو آپ کو کئی سال سے اخبار میں پڑھتا ہوں اور ریڈیو پر سنتا ہوں مگر جب سے آپ کا ظہور مارشل ایڈ کی شکل میں ہوا ہے۔ ہر طرف آپ ہی کے دم کا ظہور نظر آتا ہے۔

جس پھول کو چھیڑتا ہوں زر تیرا ہے

جس دل سوزی اور محبت سے آپ نے ترکی اور یونان کی دستگیری (مناسب شرطوں پر) کی اور جس دریا دلی اور سخاوت سے برطانیہ اور مغربی یورپ کے ملکوں کو اربوں کی رقم (مناسب سود پر) دے ڈالی ہے اس پر کون ہے جس کی روح نہ پھڑک اٹھی ہو (اور رال نہ ٹپک پڑی ہو)

میں نے آپ کو خط لکھنے کی تکلیف کیوں گوارا کی ؟ اجی نہیں تکلیف کاہے کی، عین راحت ہے۔ ہاں یہ کم بخت ڈاک کا محصول ضرور کھلتا ہے۔

دراصل مجھے آپ سے دو باتیں کہنی ہیں۔ ایک یہ کہ آپ نے ایک دنیا بھر پر مارشل ایڈ کا وار کیا بہ قول شخصے :۔

ڈالر نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

پھر آخر مارشل اسٹالین کو کیوں چھوڑ دیا کیا آپ نے ہمارے ہاں کی یہ مثل نہیں سنی۔

زر بر سر فولاد نہی نرم شود

اس پر کبھی فرصت میں غور کیجئے گا۔ اس وقت تو دوسری بات سُن لیجئے، جو اس سے زیادہ ضروری ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ اب آپ کی مارشل ایڈ ایشیا پر نازل ہونے والی ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو میں آپ کو اس غریب کے حالِ زار پر توجہ دلانا چاہتا ہوں جو اس مدد کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔ یہ بدنصیب ہندوستان کا سرمایہ دار ہے۔ کہاں وہ لڑائی کے زمانے میں دو سو تین سو فیصدی نفع کھلے بندوں کماتا تھا۔ اور کہاں اب مشکل سے اسے دس پندرہ فی صدی ایمانداری سے اور پچاس یا ساٹھ فیصدی چور بازاری سے ملتا ہوگا اور پھر اوپر سے اگلے پچھلے انکم ٹیکس کی دھونس نے پریشان کر رکھا ہے۔ دو ہی تین سال میں یہ حالت ہو گئی کہ جو دیکھتا ہے کہتا ہے۔

ٹیکس کے ڈر سے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری سرمایہ داری ہائے ہائے

اس مصیبت میں اگر آپ اس کے کام نہیں آئیں گے تو اور کون کام آئے گا؟ ظاہر ہے کہ اپنی نیکی کا بدلہ "وہ در دنیا" تو آپ خود ہی وصول کر لیں گے۔ اب رہا "ہفتاد در آخرت" تو وہ آپ جانیں اور "مالک" جانے۔

آپ کا

یارِ شاطر

۷

۸ ستمبر ۱۹۴۹ء

فاضل مقرر کا اصلی نام تو مرزا فہیم بیگ ہے۔ مگر لوگ ان کو مرزا گھن گرج کہتے ہیں۔ بڑے ڈیل ڈول کے آدمی ہیں۔ پر لمبائی چوڑائی مٹاپے سے شرما کر کچھ سکڑ سی گئی ہے۔ گول مٹول دھڑ، پتلی سی لمبی گردن اور تنگ دہانہ۔ جب پالتھی مار کر تخت پہ بیٹھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے کھڑا ڈھول رکھ کر اس پہ لاؤڈ اسپیکر لگا دیا ہے۔ آنکھیں کسی قدر چھوٹی اور چندھی اور چہرہ زرد اور بے رونق ہے۔ عام طور پہ ایسا لگتا ہے جیسے اس مٹی کے لندھور میں جان ہی نہیں۔ جہاں کسی نے رکھ دیا رکھا ہوا ہے مگر جہاں ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور ع

نقارۂ دغا پہ لگی چوٹ ناگہاں

دور دور تک زمین ہل جاتی ہے اور سننے والوں کے دل دہل جاتے ہیں۔

ہم نے جو مرزا صاحب کو فاضل مقرر کہا اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ وہ عام جلسوں میں جا کر تقریریں کرتے ہیں۔ گو قانون کی اصطلاح میں انھیں جائداد غیر منقولہ نہ کہہ سکیں۔ مگر بیچارے کشش ثقل کے ہاتھوں ایسے مجبور ہیں کہ نقل و حرکت ان کے لئے محال عقلی ہو کر رہ گئی ہے، ہم نے تو جب دیکھا انھیں ان کے مکان کے احاطے میں ایک

بڑے سے تخت پر جسے لوگ ان کا پایۂ تخت کہتے ہیں، نصب پایا وہیں تیسرے پہر سے آس پاس کے بے فکروں کا مجمع ہو جاتا ہے۔ اور رات گئے تک رہتا ہے۔ گلی کی موریوں کی عفونت سے لے کر بحرالکاہل کی سیاست تک کوئی موضوع نہیں جس پر حلق آزمائی نہ ہوتی ہو۔ اور سب باتوں کو تو مرزا صاحب سکر کے عالم میں چپ چاپ سنتے رہتے ہیں۔ مگر مسلمان ملکوں کا نام آتے ہی ان پر سکرات کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ گلے سے ایک روح فرسا گڑگڑاہٹ پیدا ہوتی ہے جس سے ناواقف چونک پڑتے ہیں کہ شاید معدی کرب دم توڑ رہا ہے۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ محض مرزا گھن گرج کے کھنگارنے کی آواز ہے۔ اس کے بعد فوراً طوفان پھٹ پڑتا ہے: یہ تم لوگ کیا فلسطین کے بارے میں عقلی گدّے لڑایا کرتے ہو۔ ہم سے پوچھو جو تحریک خلافت کے زمانے میں برسوں اس دشتِ پُر آشوب کی سیاحی کر چکے ہیں۔ اور اپنی وحشت دل کے بل پر دنیا میں اس سرے سے اس تک ہلچل ڈال چکے ہیں۔ ع

زلیخا لیے عالم میں تھے جب دل مرا بے تاب تھا

کیا کہا نتیجہ اور فائدہ! تمہیں شرم نہیں آتی۔ بنیوں کی طرح سود و زیاں کا حساب کرنے! مسلمان، مجاہد، غازی، مردِ خدا، مردِ مومن، مردِ حُر، کہیں نتیجے اور فائدے کو دیکھتا ہے۔ ع

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

یہ کون بولا کہ خود نہیں کودا۔ دوسروں کو ڈھکیل دیا؟ نعوذباللہ
یہ شیطان کی آواز ہے جو مرد مومن کے دل میں وسوسہ پیدا کر دیتی ہے
مسلمانوں میں من و تو کا فرق کرنا کفر ہے۔ میں نہ سہی تو نہ سہی۔ اصل چیز تو آتش
نمرود میں کودنا ہے، متاعِ زندگی، دولتِ ہوش و خرد، سرمایۂ راحت و
عافیت لٹانا ہے۔ خیر تو میں کہہ رہا تھا کہ ع

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے

ہم جانتے ہیں کہ جزیرۃ العرب میں فتنۂ یہود کے سر اُٹھانے کا
سبب کیا ہے۔ صرف یہ ہے کہ عرب کے مسلمانوں میں غیرت و حمیت نہیں
رہی عشق کی حرارت نہیں رہی۔ شجاعت و بسالت نہیں رہی اسکے دل میں درد کی لذت نہیں رہی۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

مانا کہ یہودیوں کی فوج بہت منظم تھی، مانا کہ ان کو روس اور
امریکہ دونوں کی مدد سے زبردست مالی اور جنگی وسائل حاصل تھے
یہ بھی تسلیم کہ لڑائی کے جاری رکھنے میں عرب ملکوں کے لئے
ہلاکت کا خطرہ تھا، لیکن مردِ حُر کہیں ہلاکت سے ڈرتا ہے۔ وہ تو اس کی
دال روٹی اس کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اب یہ میاں شرق اردن صاحب
انگریزوں سے ساز باز کر کے، شام اور عراق سے مل کر ایک متحدہ
ریاست یہودیوں کے مقابلہ کے لئے بنانا چاہتے ہیں، کوئی پوچھے بھلا یہ
داؤ پیچ مسلمان کو زیب دیتے ہیں اور پھر انگریز سے مدد لینا۔ ع

حقا کہ باعقوبت دوزخ برابر است

کاش ہم کو جزیرۃ العرب کے دورے کا موقع مل جائے۔ کیا فرمایا آپ نے؟ جی ہاں اسی تختِ سلیمانی پہ بیٹھ کر۔ کچھ اجارہ ہے آپ کا؟ بس جہاں سے گذروں ایک ہوئے قلندرانہ ایک نعرۂ مستانہ۔ ع

جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

یہ کس بدتمیز نے ہانک لگائی۔ ع

جو ذہن کو الجھا دے جو عقل کو چکرا دے

بس اب حد ہو گئی۔ تم لوگوں کے سامنے تقریر کرنا بین کے آگے بھینس۔ — لاحول ولاقوۃ! ان بدتمیزوں کے چکر میں پڑ کر ہم خود چکرا گئے۔

۸

۲۴ ستمبر ۱۹۴۹ء

"یا اللہ خیر! یہ سویرے سویرے کون سی بلا نازل ہوئی؟ ارے آپ ہیں؟ بھئی خوب آئے بابو صاحب۔ اس وقت آپ ہی کی ضرورت تھی۔ آج تسبیح تڑکے سے دل پہ کچھ گھبراہٹ سی ہے اور خمیرۂ گاؤزبان جو کچھ بچا کھچا رہ گیا تھا وہ چوہے کھا گئے۔"

"ذرا ہر ایک شاعر کے گھر کے چوہے بھی خفقانی ٹھہرے۔ مگر میری آپ کو کیا ضرورت تھی؟ کیا میں کوئی خمیرہ یا معجون ہوں؟"

"واہ بابو صاحب واہ! آپ کو آج تک اپنی خاصیت کی خبر نہیں۔ اجی آپ تو طرفہ معجون ہیں۔ مزاج، قوام چاشنی ایک سے ایک بڑھ کر دلچسپ اور پھر تاثیر کا کیا کہنا۔

باعثِ فرحت دل بے تاب
دافع قبض خاطر احباب"

"واللہ خوب کہی مگر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ معجون کی تعریف ہے یا مسہل کی؟ آخر آپ نے جلاب کا قافیہ کیوں نہیں باندھا؟"

"جلاب بھی کوئی باندھنے کی چیز ہے؟ آپ جس شاعر یا حکیم سے چاہئے، پوچھ لیجئے۔ اچھا اب ذکر کو چھوڑیئے یہ بتایئے کہ آپ کے اور پروفیسر رنگا کے دوست میاں چیانگ کائی شک کا کیا حال ہے؟"

"حال کیا ہوتا ڈٹا ہوا ہے میدان میں۔"

"کمال کیا آپ نے حریف نے پیچھے ڈھکیلتے ڈھکیلتے سمندر تک تو پہنچا دیا اور آپ فرماتے ہیں کہ ڈٹا ہوا ہے۔"

"اجی وہ موساتوں کیا ڈھکیلتا۔ ہمارے پہلوان نے آپ ہی ڈھیکلی کھائی میاں خوجی کی طرح۔"

"کیا کہنا ہے۔ کہیں اب کی ڈھیکلی میں غڑاپ سے بحر پیسفک کے اندر نہ پہنچ جائے۔"

"تو اس میں کون سا غضب ہو جائے گا۔ وہاں بھی میرا شیر مگرمچھ کی طرح اینڈتا پھرے گا مگر دیکھو انصاف سے کہنا۔ ایسے دم خم

کسی کے دیکھے ہیں؟ مٹھی بھر آدمیوں کو لئے کنٹون میں اسی شان سے
اکڑ رہا ہے جیسے اب بھی ساری چینی فوج کا سپہ سالار ہو۔"

"بابو صاحب جب تک سدھ بدھ نہ ہو خالی دم خم سے کام نہیں
چلتا۔ آپ نے یہ نئی حرکت بھی ملاحظہ کی؟ مادام سُن یات سین کی گرفتاری
کا حکم صادر فرمایا ہے۔ کوئی پوچھے کہ میاں چرکٹ تم مادام کو کیا گرفتار
کرو گے۔ کہیں اس دام میں آپ ہی نہ پھنس جاؤ۔"

"ارے وہ بچارہ تو پہلے ہی کمربندی رشتے میں جکڑا ہوا ہے۔
بہ قولِ شخصے۔ ع

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟"

"کاش ایسا ہی ہوتا مگر اس کی وحشت سے تو زنجیریں بھی پناہ
مانگتی ہیں۔ اب سُنا ہے کنیٹن سے چینگ گنگ کی تیاریاں ہیں۔"

"کیا کیا جائے۔

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں"

۹

یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء

"بم، بم، بم! شانتی، شانتی، شانتی!"

"اے ہے کیا ہوا ؟ میں جانوں کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ کلمہ پڑھو کلمہ"

"خواب تو دیکھ رہا ہوں مگر بھیانک نہیں۔ ایسا شیریں جیسے تمھارے لب نازک ــــ"

"بس رہنے دو، مجھے یہ چونچلے نہیں بھاتے"

"ــــ جیسے تمہارے لب نازک۔ تمبا کو کھانے سے پہلے"

"اب مسخرے پن میں بات نہ ٹالو۔ یہ شانتی کون چڑیل ہے جس کی پکار ہو رہی تھی"

"توبہ کرو توبہ! وہ دیویوں کی دیوی ہے، روح کی راحت، دل کا چین۔ آنکھوں کا نور ــــ"

"ارے تو وہ نور چشمی ہیں، کون، کچھ معلوم تو ہو"

"ــــ جس کے لئے انسان کا دل درد سے تڑپ رہا تھا"

"اور شیطان کی پسلی شرارت سے پھڑک رہی تھی۔ دیکھو مجھے جلاؤ نہیں۔ سچ سچ بتادو کہ یہ نیک بخت کون ہیں جن کے لئے اس طرح پھڑک رہے تھے"

"ارے تم کیا سمجھ رہی ہو! وہ امن کی دیوی ہے۔ جس کے بغیر دنیا خوف سے لرز رہی تھی کہ کہیں ایٹم بم کے ایک دھماکے میں آہے وغبارے وبخارے ودخانے

کا معاملہ نہ ہو جائے"

"دنیا کو تو میں جانتی نہیں، ہاں تم ضرور رازغیبی گوسے کے ڈرسے پھولتے چلے جاتے ہو۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ آخر وہ شانتی دیوی خواب میں کیا کہہ گئیں ؟"

"اس نے کہا ـــــ خوش ہو جا میرے بھگت۔ روس نے اٹیم بم بنا لیا۔ بس اب میں آتی ہوں"

"لو اور سنو! میں کہتی ہوں تمہاری عقل سچ مچ بھگت ہو گئی ہے جب دونوں طرف وہ موا ایٹم بم بن گیا تو امن کی اُمید اور گھٹ گئی یا بڑھ گئی ؟"

"بڑھ گئی بیگم، تمہاری زلفِ دراز کی قسم بڑھ گئی۔ یہی تو مزے کی بات ہے۔ فریق الف کے پاس ہتھیار ہو، اور فریق ب نہتا ہو تو الف بات بات پر لیان سے باہر ہو جاتا ہے۔ مگر جب دونوں مسلح ہوں تو پھر ذرا سمجھ بوجھ کر لڑائی کا نام لیتے ہیں۔ تم اس کو یوں دیکھو جیسے تمہارے پاس تیرِ نظر ہے اور ہم بچارے نہتے ہیں تو تمہارا دل یہی کہے گا نا۔ ع

تیر پہ تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے

لیکن جب آئینہ سامنے ہو اور دوسری طرف بھی تیر انداز کمان میں تیر جوڑے لیس کھڑا ہو تو تمہارے تیور لڑائی کے ہوں گے یا صلح کے ؟"

"باتیں بنانا کوئی تم سے سیکھ لے۔ مگر تم کچھ بھی کہو ہمیں تو یہ اُلٹی

بات معلوم ہوتی ہے کہ روس نے ایٹم بم بنا لیا۔ اس سے لڑائی
رُک جائے گی۔"
"کیا کیا جائے بیگم، اس اُلٹے زمانے میں ہر چیز اُلٹی ہی ہے
ع ہم اُلٹے، بات اُلٹی، یار اُلٹا

۱۰

یکم نومبر ۴۹ء

آزادی جسے کہتے ہیں وہ تو سوتے سنسار یعنی سپنوں کی دنیا ہی
میں نصیب ہوتی ہے، یوں تو آزاد جمہوری ریاست میں ہر شہری کو (جس میں
قصباتی، دیہاتی، پہاڑی اور جنگلی بھی شامل ہیں) ہر قسم کی مذہبی، لامذہبی،
معاشی، سیاسی، قیاسی، تہذیبی، زبانی کاروباری، چور بازاری کی
آزادی حاصل ہے۔ مگر پھر بھی عقل، شرع، قانون، آرڈی نینس،
رسم و رواج، بیوی، ساس کے ایسے کڑے پہرے بیٹھے رہتے ہیں کہ
میاں مٹھو کو پر پھڑ پھڑانے کا ذرا سا موقع بھی نہیں ملتا۔ بس آزادی
کے پنجرے میں گلدم کی طرح اڈے پر بیٹھے رہتے ہیں۔ بہت ہوا تو
اپنے پنجرے کے اندر ہی ادھر اُدھر پھدک کر بیٹھ گئے۔ ہاں سوتے
میں البتہ جاگتے جیون کی یہ سب پابندیاں دور ہو جاتی ہیں۔ سب بیڑیاں
کٹ جاتی ہیں۔ بہ قول شاعر۔

مٹ گئیں جب انکھڑیاں تب سو رسب آنند ہیں

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ زمان و مکان کی قید بھی جس نے آئن اسٹائن تک کو پریشان کر رکھا ہے۔ اٹھ جاتی ہے اور ہمارا پنچھی دم کے دم میں سینکڑوں ہزاروں میل مہینوں برسوں، آگے پیچھے، وقت اور جگہ کے جس نقطے پر چاہتا ہے جا پہنچتا ہے۔

ابھی کل رات ہی کا تو ذکر ہے کہ الف لیلہ میں سوتے جاگتے کا قصہ پڑھتے پڑھتے آنکھ لگ گئی، دیکھتے کیا ہیں کہ نئی دنیا کا ایک غدار شہر ہے جس کا نہ کہیں اور نہ چھور۔ چاندی کی سڑکیں، سونے کی عمارتیں، مارشل ایڈ کے درخت، ڈالر کے پتوں سے لدے ہوئے، سڑکوں پر خلقت کا وہ ہجوم کہ تھالی پھینکو (اور وہ کسی مردانے یا زنانے ہیٹ میں اٹک کر نہ رہ جائے) تو سروں ہی سروں کوسوں تک چلی جائے اور سنتے کیا ہیں کہ لاکھوں، کروڑوں گلوں سے ایک ہی ایک نعرہ نکل کر فضائے آسمانی میں گونج رہا ہے"۔۔ زندہ باد۔۔ "زندہ باد" زندہ باد سے قبل ایک رعب دار بے معنی سی جھنکار سنائی دیتی تھی۔ پہلے ہم سمجھے کہ یہ انقلاب کا لفظ ہے مگر غور سے سنا تو معلوم ہوا کہ ہمارا ہی شبھ نام ہے۔ اگر کہیں جاگتے میں ہم نقارۂ خدا یعنی زبان خلق سے اپنے حق میں "زندہ باد" کا نعرہ سن لیتے تو شاید ایسا دھچکہ لگتا کہ فوراً ہی "مردہ باد" ہو جاتے مگر اس وقت یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ لوگ عمر بھر سناتے رہے ہیں اور ہم سنتے رہے ہیں

ہاں یہ تو آپ سے کہنا بھول گئے کہ ہم اس سمے ایک بیش قیمت ایرانی قالین پر کارچوبی گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے تھے اور قالین خود بخود ہوا میں تیرتا چلا جا رہا تھا۔ خیر تو یہ جادو کا قالین تھوڑی دیر میں ایک بہت بڑے ہال میں جا کر ہوا میں معلق ہو گیا۔ ہمارے پہنچتے ہی سارا ہال جو خواتین اور حضرات سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تالیوں سے گونج اٹھا۔ اس کے بعد ہمارے کان میں ایک آواز آئی جس کے متعلق یہ کہنا مشکل تھا کہ کسی اور کی ہے یا خود ہماری کہ "جو ہو سو ہو، اب تو کہہ بھی ڈالو۔" چنانچہ ہم نے کہنا شروع کیا:۔

بہنو اور بھائیو۔ ابھی چند روز ہوئے، آپ افق مشرق کے مہر درخشاں جواہر لال کا استقبال کر چکے ہیں جس کے مقابلے میں ہم ایک ذرۂ ناچیز ہیں۔ یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ بات ہم محض انکسار سے کہہ رہے ہیں۔ آپ کی بڑی ذرہ نوازی ہے کہ آپ نے ہمارا استقبال بھی اسی شان سے کیا۔ ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ یہاں آنے سے ہماری غرض، قرضہ یا ڈگری یا گیہوں لینا نہیں۔ یہاں تک کہ ہم ایڈریس بھی لینا نہیں چاہتے۔ ہاں اگر ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ آپ کا شکریہ ادا کریں اور آپ سے شکایت کریں۔ شکریہ اس کا کہ آپ کے ارباب علم و فن نے جو آپ کے دل و دماغ ہیں۔ ہمارے محترم قائد کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔ آپ کے ارباب محنت نے جو آپ کے دست بازو ہیں ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کا ہمارے دل پر بہت گہرا اثر ہوا۔ مگر اسی کے ساتھ ہم کو یہ شکایت ہے کہ آپ کے ارباب دولت نے جنھیں آپکا

شکم و معدہ کہنا چاہئے۔ ان کو تر لقمہ سمجھ کر ہڑپ کرنے کی کوشش کی۔ آپ انھیں جتا دیجئے کہ ہیرا جتنا صاف شفاف اور چمک دار ہوتا ہے اتنا ہی سخت اور تیز بھی ہوتا ہے۔ وہ سر پہ سجتا ہے، پیٹ میں نہیں پچتا۔ اس کی جگہ طرف کلہ ہے۔ قعر شکم نہیں۔ بس یہی چند لفظ ہمیں آپ سے کہنے تھے۔
خدا حافظ! جے ہند!

۱۱

۱۶ر فروری ۱۹۵۰ء

"ہم صبح چائے کے فراق میں میر صاحب کی بیٹھک میں جو داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ چہرے پہ ہوائیاں اُڑ رہی ہیں، رنگ زرد ہے ہونٹ خشک ہیں۔ آنکھیں بند کئے بلک بلک کر دعا مانگ رہے ہیں۔ اے مرے اللہ جل تو جلال تو، صاحب کمال تو آئی بلا کو ٹال تو۔"

ہم نے بھی ہانک لگائی "اے اللہ کے بندے، ہوش ذرا سنبھال تو، دیکھ تو اپنا حال تو، لب پہ نہ لا یہ قال تو۔"

میر صاحب نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں، ہم کو دیکھتے ہی ان کا خشوع و خضوع غائب ہو گیا اور اس کی جگہ قہر و جلال نے لے لی۔ ڈپٹ کر بولے "یہ کیا بے ہودہ پن ہے۔ کسی کی جان پہ بنی ہے اور آپ کو دل لگی سوجھی ہے۔ تُک بندی فرما رہے ہیں۔" ہم نے معصومیت کے انداز میں کہا۔
"میر صاحب تُک بندی اگر کوئی بری چیز ہے تو آپ کیوں فرما رہے تھے

قصور معاف۔ آپ جلالتو اور کمالتو کی ضربیں لگائیں تو وہ بڑا بیہودہ پن ہے اور ہماری زبان سے حالتو اور فالتو نکل جائے تو بے ہودہ پن ہو گیا خیر اسے چھوڑیئے، یہ بتایئے کہ یہ جان پہ بننے کا کیا قصہ ہے۔ کیا خدانخواستہ وہ بواسیر کی شکایت پھر شروع ہو گئی؟"

"میر صاحب اور بھڑک گئے اس لئے کہ یہ ان کا سربستہ راز ہے جسے وہ کسی پہ ظاہر نہیں کرتے۔ وہ علت بواسیری کو شانِ میری کے خلاف سمجھتے ہیں اور جب یہ کیفیت ان پہ طاری ہوتی ہے تو اسے قبض کہا کرتے ہیں جیسے قبض کوئی بڑا ثقہ مرض ہو، کمزور کا غصے کے زور میں جو کھٹکھنا لہجہ ہوتا ہے۔ اس میں کہنے لگے "بس رہنے دو اپنی سفلی باتیں تمیز سے گفتگو کرنا ہو تو کرو، ورنہ چلتے پھرتے نظر آؤ"

ہم میر صاحب سے پوچھنا چاہتے تھے کہ آخر سفلی چیز کے لئے علوی نام کہاں سے آئے۔ مگر مصلحت سمجھ کر ٹال گئے۔ اس لئے کہ ہمیں اس وقت یہ معلوم کرنے کی فکر تھی کہ میر صاحب کی جانِ حزیں پہ کیا بنی ہے۔ اور کیوں بنی ہے۔ چنانچہ ہم نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"میر صاحب خدا کے لئے یہ بتا دیجئے کہ وہ کون سا درد پنہاں ہے جس نے اندر سے آپ کے دشمنوں کی جان پہ بنا دی اور باہر سے آپ کا حلیہ بگاڑ دیا"

ہمارے اس طرح چھینٹا دینے سے میر صاحب ٹھنڈے پڑ گئے اور آہ سرد بھر کر بولے "ارے میاں ہم کیا اور ہمارا حلیہ کیا۔ ہمیں تو

اس نامراد دنیا کی فکر ہے کہ مفت میں حیدر جن کے ہاتھوں برباد ہو رہی ہے۔ سنتے ہیں کہ ایک پھونک میں بھک سے اُڑ جائے گی۔"

ہم کو بے اختیار ہنسی آ گئی اور ہم نے کہا: "بس؟ آپ کی یہ ساری ہول دلی جنات کے خوف سے تھی؟ آپ کو معلوم نہیں کہ اس بیسویں صدی میں پریوں کا سایہ اُٹھ گیا اور جن ہوا ہو گئے۔ مگر میر صاحب یعقوب جن کا ذکر تو مدت سے سن رہے تھے، حیدر جن کا نام آج ہی سنا۔ آخر ان بزرگ کی شانِ نزول کیا ہے؟"

میر صاحب نے اس سادگی سے جس پر "کون نہ مر جائے اے خدا" فرمایا۔

"ارے بھئی یہ حیدر جن کوئی ایسا ویسا نہیں بڑا گمبھیر، گھن گرج، فرمائشی جن ہے، کیمیا، سیمیا کے اسم اعظم سے بلایا گیا ہے۔ کوئی کہتا ہے امریکہ نے بلایا ہے۔ کوئی کہتا ہے روس نے۔ یہ بنے صاحب کے سوتیلے بیٹے جو اخبار کے دفتر میں نوکر ہیں نا، کہہ رہے تھے کہ صاحب جہاں فلیٹ جلایا، بس دم بھر آنکھوں سے آگ برساتا۔ منہ سے انگارے اُگلتا آن موجود ہوا۔ اور اس کی پھنکار اس غضب کی ہے کہ داستان امیر حمزہ کی تاریک تشکل کش یاد آجاتی ہے۔ ایک سانس میں کوسوں دور تک کی زمین پر آدم زاد، چرند، پرند سب دھواں بن کر اڑ جاتے ہیں۔ پتہ نہیں چلتا کہ کیا ہوئے۔ اب تمہیں سوچو کہ اگر خدانخواستہ کسی نے اسے ناس کی ایک چٹکی سنگھا دی اور چھینکیں آنے لگیں تو پھر یہ زمین کہاں آسمان

کہاں، تم کہاں اور ہم کہاں ؟"

ہم اب سمجھے کہ یہ حیدر جن کس چیز کا استحالہ ہے اور میر صاحب کے دماغ کے محل میں کیوں کر تیار ہوا ہے۔ ہم نے دل میں خیال کیا کہ اس وقت تو میر صاحب کو کسی نہ کسی طرح تسکین دینی چاہئے۔ کہیں اس دھڑکے میں ان کا مرغ روح پرواز کر گیا تو بزم بے تکلف سونی پڑ جائے گی۔ چنانچہ ہم نے ہنس کر کہا "بھئی واہ میر صاحب! آپ بھی کیا کیا باتیں سوچ سوچ کر اپنا دل ہولایا کرتے ہیں۔ جب سب کو یہ معلوم ہوگا کہ حیدر جن کی چھینکوں سے دوسروں کے ساتھ وہ خود بھی تباہ ہو جائیں گے تو کس کو اپنی جان بھاری ہوگی جو اسے ناس سنگھائے گا اور جو کہیں دنیا کے جنون وحشت کی یہ نوبت پہنچ گئی کہ ایک پوری قوم دوسروں کو مٹانے کے لئے خود مٹنے پر تیار ہو جائے تو پھر ایسی دنیا میں رہ کر اور اس دنیا کو رکھ کر کیا کیجئے گا۔ جب انسانیت ہی کا ناس لگ جائے تو ہمارے حساب دنیا مٹ چکی۔ پھر حیدر جن کو ناس سنگھانے یا نہ سنگھانے سے کیا فرق پڑیگا۔"

"واللہ سچ کہا تم نے۔ جہاں ستیاناس وہاں سوا ستیاناس۔ اصل میں فکر انسانیت کی کرنی چاہئے۔ وہ رہی تو جگ رہا اور وہ ڈوبی تو جگ ڈوبا۔"

۱۲

یکم جون سنہ ۶۵ء

"اے میں کہتی ہوں یہ آج چہرے پر محرم کیوں برس رہا ہے کیا اس نگوڑے چین ماچین سے پھر کوئی بُری خبر آگئی۔"

"خدا نہ کرے خدا نہ کرے۔ بس تمھاری یہی بات تو مجھے زہر لگتی ہے کہ بے سوچے سمجھے بدفال منہ سے نکال بیٹھتی ہو۔ چین سے بُری خبر کیوں آتی وہاں تو اب راوی چین لکھتا ہے۔"

"تو پھر آخر یہ کیا بات ہے کہ جب سے ڈاک آئی ہے۔ بس سر نہوڑائے منہ لٹکائے رونی صورت بنائے بیٹھے ہو۔"

"ارے بھئی بات کچھ بھی نہیں۔ بس اک ذرا کلفی گری ہوئی ہے وہ جو ہم نے اس دن جواہر لال کو خط لکھا تھا نا کہ انڈونیشیا جانے سے پہلے ذرا ہم سے ملتے جانا تو آج اُن کے پرائیوٹ سکریٹری کا خط آیا ہے کہ آنریبل پرائم منسٹر کا وقت بالکل گھرا ہوا ہے۔ انھیں افسوس ہے کہ وہ آپ سے نہیں مل سکتے۔"

"تو اور تم کیا سمجھتے تھے کہ جواہر لال ہانپتے کانپتے دوڑے چلے آئیں گے۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ یہ کیا حماقت کر رہے ہو۔ مگر تمھاری عقل پر تو کسی نے ٹوٹکا کر دیا ہے۔ آخر کو خط لکھ ہی مارا۔ وہ تو کہو انکا پرائیوٹ کوئی بھلا آدمی تھا۔ نہیں تو وہ ڈانٹ بتاتا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا اور

پھر اوپر سے پاگل خانے بھجوا دیتا۔"

"کیا مجال ہے اُس کی۔ یہ کوئی نادر شاہی تھوڑا ہی ہے۔ جمہوری حکومت ہے۔ پاگل خانے بھجوانا کوئی ہنسی ٹھٹھا نہیں۔ ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ چاہیئے۔"

"ڈاکٹر جب سُنتا کہ ایک مکتب کا مُلا ہندوستان کے وزیراعظم کو اپنے گھر حاضری دینے کا حکم دے رہا ہے تو سارٹیفکیٹ کیا، موئے ڈبلو کے ڈبلوے اُٹھا کے دے دیتا۔"

"لاحول ولاقوۃ، تم عورتوں کی عادت ہے کہ غیر متعلق بحثیں چھیڑ دیتی ہو اور اصل بات رہ جاتی ہے۔ ہمیں نہ اس پر اصرار تھا اور نہ اس کا افسوس ہے کہ جواہر لال ہمارے ہاں کیوں نہیں آئے اگر وہ چاہتے اور ڈیوڑھے درجے کا آنے جانے کا کرایہ بھیج دیتے تو ہم خود چلے جاتے۔ افسوس تو اس کا ہے کہ وہ اتنے بڑے اہم سیاسی مشن پر جا رہے ہیں اور انھیں قیمتی مشورہ مفت مل رہا ہے۔ مگر اتنی توفیق نہیں کہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں۔"

"لو اور سنو تم ہی تو ان کو مشورہ دو گے اور یہ اللہ کی سنوار ہی ایشیا کی سوتیلی بیٹی نیشیا کہاں ہے اور تمھیں اس کی کیا خبر، جو جواہر لال کو مشورہ دینے چلے ہو۔"

"خالی نیشیا نہیں انڈونیشیا کہو۔ بحرالکاہل میں ملایا اور فلپائن کے درمیان ایک مجمع الجزائر ہے مگر تم نے ایشیا کی سوتیلی بیٹی کی خوب

کہی۔ سچ پچ اس کا رشتہ ایشیا سے یا کم سے کم ہندوستان سے ایسا ہی ہے جیسا سوتیلی بیٹی سے ہوتا ہے کہ سمجھو تو اپنی اولاد اور نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اب بھی تمہیں کیا بتاؤں تم کیا سمجھو گی۔ جواہر لال ہوتے تو ان کو سمجھاتا کہ ایک زمانے میں انڈونیشیا کا ہندوستان سے کتنا قریبی تعلق تھا اور اس کی تہذیب پہ قدیم ہندی تہذیب کا کتنا گہرا اثر ہے۔ ان کو چاہیئے اس ملک سے دوستی کی گرہ ایسی مضبوط باندھیں کہ دشمنوں کے توڑے نہ ٹوٹے اور کھولے نہ کھلے۔"

"اور وہ کاہے کے لئے جا رہے ہیں، کالی مرچوں کا کاروبار کرنے؟ مگر تم نے یہ نہ بتایا کہ تمہیں اس ملک کا حال کہاں سے معلوم ہوا نہ کبھی آئے نہ گئے۔"

"تم بھی کیسی بھولے پن کی باتیں کرتی ہو۔ ارے کتابوں سے گھر بیٹھے ساری دنیا کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ ہم نے اس کا ذکر "جگ بیتی" میں پڑھا ہے۔ "تلاشِ ہند" میں پڑھا ہے۔"

"تو کیا جواہر لال نے یہ کتابیں نہیں پڑھی ہوں گی؟"

"ہرگز نہیں! اپنی لکھی ہوئی کتابیں کون پڑھتا ہے؟"

١٣

١٦ رجولائی ۱۹۵۰ء

"بیگم، بیگم، ارے تم کہاں ہو؟ چھڑ گئی بھڑ گئی، واللہ اب کی

سچ مچ بھڑک گئی۔"

"الٰہی خیر! آج پھر دورہ پڑا ہے۔ جاؤ سیدھے غسل خانے میں جاؤ اور نل کے نیچے بیٹھ کر سر دھو ڈالو۔"

"دورہ نہیں بیگم، خبر ہے اخبار کی۔ یقین نہ ہو تو خود آ کر دیکھ لو۔"

"چولھے میں ڈالو موئے اخبار کو۔ یہاں پھونکتے پھونکتے ناک میں دم آ گیا اور یہ نصیبوں جلی لکڑیاں ہیں کہ کسی طرح سلگنے میں نہیں آتیں۔"

"ارے تمہیں لکڑیوں کے سلگنے کی پڑی ہے۔ وہاں آگ لگ گئی۔ شعلے بھڑک اٹھے۔"

"اے ہے کہاں لگ گئی آگ؟ خدا کے لئے جلدی بتاؤ۔ کہیں کاکوری کی خبر تو نہیں۔"

"کاکوری کی نہیں۔ کوریا کی خبر ہے بیگم۔ وہاں لڑائی کی آگ لگ گئی۔ جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ شمالی کوریا نے جنوبی کوریا پہ چڑھائی کر دی۔"

"اللہ توبہ! مجھے دہلا دیا لے کے۔ میں سمجھی کہیں سچ مچ آگ لگ گئی۔"

"سچ مچ کی آگ اور کیسی ہوتی ہے۔ اسٹین گن، برین گن، چھوٹی بڑی توپیں دنادن دھڑا دھڑ فیر کر رہی ہیں۔ ہزاروں اگن بان پھینکے جا رہے ہیں۔ سینکڑوں ہوائی جہاز بم برسا رہے ہیں۔"

"جل تو جلال تو۔ ارے یہ کاکوریا ہے کہاں؟"

"کاکوری سے دور نہ سمجھو بیگم۔ کوریا منچوریا سے ملا ہوا ہے۔ منچوریا چین میں ہے اور چین کا ڈانڈا ہندوستان سے ملتا ہے۔ یہاں بھی لڑائی پہنچنے ہی کو ہے۔ اب آئی اب آئی"۔

"تم کو تو جب سے باؤلے گیدڑ نے کاٹا ہول دلی کا مرض ہو گیا ہے۔ بات بے بات ہولتے ہو اور دوسروں کو ہولاتے ہو۔ پچھلے دو تین سال میں خدا جھوٹ نہ بلائے، کوئی دس بارہ مرتبہ تم نے لڑائی کا غلغلہ مچایا اور نہ کہیں لڑائی نہ وڑائی"۔

"خدا سے ڈر نیک بخت، ایک مرد مسلمان پہ جو حاجی ہوتے ہوتے رہ گیا۔ جھوٹ کی تہمت لگاتی ہے"۔

"بس رہنے دو یہ تو تکار مجھے ایسی بدتمیزی زہر لگتی ہے"۔

"بدتمیزی نہیں یہ بلاغت ہے بیگم۔ نیک بخت کے ساتھ کچھ غائب ہی کی ضمیر مزا دیتی ہے۔ خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ پہلے بھی جب کبھی میں نے لڑائی کا اندیشہ ظاہر کیا بے جا نہیں کیا۔ منطقی استدلال بالکل صحیح تھا۔ اب اگر واقعات منطق کا ساتھ نہ دیں تو واقعات کا قصور ہے یا منطق کا؟

مگر اب کی بار تو واقعات بھی پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ یہ آگ جو کوریا میں لگی ہے، پھیلے گی اور جب پھیلی تو پھیلی، پھر کسی کے روکے نہیں رک سکتی"۔

"تو یہ بڑے بڑے مدبر زمانے بھر کے چودھری بنے ہیں دنیا

کو جلتے دیکھیں گے اور ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں گے اور وہ اللہ کی سنواری قوموں کی پنچایت آخر کاہے کیلئے ہے، عاقبت بخشوانے کیلئے؟"

"وہ بیچاری تو اپنی طرف سے بہتیرا چاہتی ہے کہ بیچ بچاؤ کر دے۔ مگر اس کے کرتا دھرتا یہی بڑے بڑے ہیں اور کوریا میں لڑائی کی آگ ان ہی کی لگائی ہوئی ہے۔ پھر بھلا یہ کیوں بجھانے لگے۔"

"اے تو سب ہی آگ لگانے والے ہیں؟ آخر کوئی اللہ کے بندے بجھانے والے بھی ہوں گے۔"

"ہیں تو ضرور مگر مشکل یہ ہے کہ بجھانے والے خالی ہوا باندھتے ہیں اور لگانے والے تیل چھڑکتے ہیں۔"

"آگ لگے ان کی عقلوں کو۔ موئے زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں اور اتنا نہیں سمجھتے کہ جب ساری دنیا جلے گی تو خود بھی اس کے ساتھ بھسم ہو جائیں گے۔"

"اسی کا تو رونا ہے بیگم جو عقل کے پتلے سمجھے جاتے ہیں، ان کا یہ حال ہے کہ ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور خدا جانے کیسے کیسے مہلک ہتھیار بنا رہے ہیں اور ان کو ایک دوسرے پر آزمانے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اگر واقعی استعمال ہوئے تو واقعی دنیا دھواں بن کر اُڑ جائے گی۔ پتہ بھی نہ چلے گا کہ کہاں گئی۔ اب بتاؤ میری پریشانی ہول دلی ہے یا دور اندیشی۔"

"ہیں تو جانوں یہ بندر بھبکیاں ہیں کہ دوسروں کو تباہ کرنے کے

لئے خود بھی تباہ ہو جائیں گے۔ کہیں ہوئے نہ ہوں۔ تم دیکھنا جب وقت آئے گا تو کھیس کاڑھ دیں گے کہ لڑائی کیسی ہم تو مذاق کرتے تھے اور جو کہیں سچ مچ مت ماری گئی ہے تو اچھا ہے قیامت آ ہی جائے نہیں تو اس باؤلی دنیا میں زندگی عذاب ہو جائے گی۔ لے لو میری آگ سلگ اٹھی، مجھے جا کر ہنڈیا چڑھانی ہے۔"

ڈرامک خزانہ

[illegible]

ا

۸ر مارچ ۴۹ء

"خدا کے لئے اب اس سرچڑھے کو ہٹاؤ۔ کب سے انتظار میں بیٹھی ہوں کہ تمہارے کان خالی ہوں تو میں بھی کچھ کہوں۔"

"تم بھی غضب کرتی ہو۔ بجٹ کے خلاصے کا سب سے مزیدار حصہ ہو رہا تھا کہ تم نے تحریک التوا کھینچ ماری۔ مگر یہ ہیڈ فون کا نام سرچڑھا خوب رکھا۔ کیوں نہ ہو آخر کس کی بیوی ہو۔ اچھا اب میرے کان خالی ہیں، تم شوق سے بھرو۔ سرچڑھا ہٹ گیا۔ اب ناک چڑھی کی باری ہے۔"

"بس رہنے بھی دو سچ مچ کسی ناک چڑھی سے پالا پڑتا تو قدرِ عافیت معلوم ہو جاتی اور میں کہتی ہوں یہ پرائے بجٹ کی رام کہانی سننے سے تمہیں کیا مل جائے گا۔ کچھ اپنے بجٹ کی بھی خبر ہے؟ مہینے میں تین

دن باقی ہیں اور گھر میں برکت ہے۔"

"پرایا کیوں ہوتا؟ اپنے دیس کا بجٹ ہے اور گھر کے بجٹ سے اسے بقول شخصے گاڑھا سمبندھ ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ اس طرح کہ فرض کرو کہ ہماری آمدنی تین ہزار سالانہ سے زیادہ ہے اور ہم اب تک روپے میں ایک آنہ ٹیکس دیتے تھے۔ اب ایک پیسے کی چھوٹ ہو جائے گی تو اس کا اثر ہمارے بجٹ پر پڑے گا یا نہیں؟"

"فرض کرنے کو جو چاہے کرلو، مگر تین ہزار کی آمدنی کس مسخرے کی ہے۔"

"دیکھو ایسے غیر پارلیمنٹری لفظ نہ کہو۔ مسخرے کو پارلیمنٹ کی زبان میں "غیر سنجیدہ معزز ممبر" کہتے ہیں۔ خیر انکم ٹیکس سے نہ سہی دوسرے کھلے ڈھکے ٹیکسوں سے تو ہم کو تعلق ہے۔ مثلاً لفافے کا ٹکٹ دو آنے کا اور پوسٹ کارڈ تین پیسے کا ہو جائے گا۔ شکر اور چھالیہ پر درآمد کا محصول بڑھ جانے کی وجہ سے یہ دونوں چیزیں مہنگی ہو جائیں گی۔"

"شاباش ان بجٹ سازوں کو، مرے کو ماریں شاہ مدار۔ اسی کو کہتے ہیں۔ اب تک مہینے میں تین دن برکت رہتی ہے تو اب چھ دن رہا کرے گی!"

"تو پھر کچھ تخفیف مصارف کی تجویز سوچو یہ جو دن بھر پان کے نام سے چھالیہ پھنکتی ہے جیسے بھٹی میں ایندھن پھنکتا ہو۔ اس کو کم کرنا چاہیئے۔"

"اور یہ جو دن بھر چائے کے بہانے شکر سڑکی جاتی ہے جیسے ریل کا انجن پانی سڑکتا ہے اُسے بھی کم کرنا چاہیئے۔"

"اچھا دونوں ترمیمیں بہ رضامندی فریقین واپس۔"

۲

۱۶ مارچ ۴۹ء

اگلے وقتوں کے لوگ کہا کرتے ہیں "سفر نمونہ سقر" کوئی پوچھے حضرت آپ نے ابھی سقر دیکھا ہی کب ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ چچا غالب نے کہہ دیا ہے۔ ع

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

اچھا صاحب انھیں کچھ نہیں کہتے۔ مگر بہ قول اہلِ پنجاب "آپ کو" تو کہہ سکتے ہیں۔ یہ بچارے چرخ چوں چھکڑوں میں سفر کرنے والے کیا جانیں کہ اس ترقی کے زمانے میں "سفر" "وسیلۂ ظفر" ہو گیا ہے۔ جی ہاں وسیلۂ ظفر۔ یہ غریب پچاس میل رورو کے تین چار دن میں طے کرتے تھے اور ہم بقول شری خوجی کے ایک ہی پینگ میں کانپور پہنچ جاتے ہیں، اور بھئی کیا ٹھمک ٹھمک چال ہوتی ہے۔ ریل گاڑی کی چھک چھک چھک چھک، بیل گاڑی کیا خاک مقابلہ کرے گی۔ اور ہاں خوب یاد آیا کہ بیل گاڑی میں تو گرد کا کوٹا مقرر ہے۔ ریل گاڑی میں بے حساب جتنی

چاہو لے لو اور کوئلہ اور دھواں کھاتے ہیں۔ جی کیا فرمایا آپ نے، بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی؟ ارے صاحب بیٹھنے کی نہ سہی، اطمینان سے لٹکنے کی جگہ تو مل جاتی ہے۔ بھلا پرانے زمانے میں کسی کو یہ لٹکا آتا تھا کہ بیل گاڑی کے پہیے کا دُھرا پکڑ کر لٹک جائے؟ اور اب کیا پوچھنا ہے۔ آزاد ہند کے شہری ایک ہاتھ سے دروازے کا ڈنڈا پکڑے دوسرے ہاتھ سے لاٹھی گٹھڑی سنبھالے مزے سے گاتے چلے جاتے ہیں، اور جو ہاتھ چھوٹ جائے؟ تو اور بھی اچھا، دنیا کے جھگڑوں سے چھٹکارا مل جائے۔

یہ بھی سنا ہے آپ نے کہ ہمارے سکن کلاس ریلوے منتری صاحب نے ڈیوڑھے کو "سکن" کر دیا ہے۔ جی اور کیا ڈیوڑھے کے دام دیجئے اور ٹھاٹھ سے سکن کلاس میں دبتے دباتے لڑتے مرتے چلے جائیے۔ دس روپلے اور خرچ کیجئے تو سونے کی جگہ "رزرو" ہو جائے گی اور آپ کو سونے کا موقع نہ سہی۔ رات کاٹنے کا مشغلہ مل جائے گا۔ ہر اسٹیشن پر لوگ آ کر دروازہ دھڑ دھڑائیں گے اور "کھُل جا سم سم" کا نعرہ لگائیں گے اور آپ "جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو" کا وظیفہ پڑھتے رہیں گے۔

جی کیا فرمایا، زنانے سکن میں سونے کی جگہ رزرو نہیں ہوتی؟ اس کی ہم ہم سے پوچھئے۔ آپ جانتے ہیں بچاری ہندوستانی عورت کی تفریح کا ایک ہی ذریعہ ہے اسے مناظرہ کہہ لیجئے یا مجادلہ یا "جج چلنا" یا تو تو میں میں۔ غریب کی زندگی کا دائرہ چھوٹا سا ہوتا ہے۔ ساری عمر ساس یا نند یا پڑوسن سے لڑتے لڑتے طبیعت اُکتا جاتی ہے۔ جی چاہتا

ہے۔ نیا میدان ہو نئے حریف (یا نئی حریفائیں؟) ہوں۔ نئے کرتب دیکھنے اور دکھانے کا موقع ملے اور یہ کبھی کبھار سفر ہی میں ملتا ہو۔ آپ چاہتے ہیں کہ اس سنہری موقع کو وہ سو کر گنوا دیں۔

(صالحہ)

۳

یکم اگست ۶۴۹

"کہئے حضرت خیریت تو ہے۔ آپ کچھ متفکر معلوم ہوتے ہیں، کیا پھر گھر میں تقریب ولادت ہونے والی ہے"

" بھلا یہ تقریب ولادت کا کون سا موقع ہے"

" موقع محل تو آپ جانیں۔ میں نے تو ایک روایت سُنی تھی۔ اصل ماخذ تک پہنچنا دشوار تھا۔ اس لئے آپ سے پوچھ لیا"

" نہیں بھائی آج کل تو اپنی ہی ولادت پر افسوس ہے"

" اب افسوس نہ کیجئے۔ بہت دن کی بات ہو گئی اور پھر آپ کا اس میں کیا قصور"

" قصور کیا ہوتا، شامت ہے۔ ع

انساں بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی"

" اس میں " انساں بنا کے" محل نظر ہے اور " مٹی خراب کی" قبل از وقت ہے"

"آپ کو تو ہر وقت مسخرا پن سوجھتا ہے۔"
"مسخرا پن آنکھوں کے سامنے ہو تو کیسے نہ سوجھے!"
"بھئی تم تو آدمی کی جان کو آجاتے ہو۔ اسی لئے تو تم سے بات کہتے ڈر لگتا ہے۔"
"اچھا اب جان کی امان ہے۔ کچھ بتائیے تو کہ معاملہ کیا ہے؟"
"معاملہ وہی ہے جو آپ نے سنا ہے۔ پانچ برس میں چار بچے ہو چکے ہیں اور اب ——"
"نقشہ ایک اور نے جمایا۔ پس ماندہ کا پیش خیمہ آیا۔ مگر اس میں اتنی فکر کی کیا بات ہے۔"
"یار سو سو روپلی کی آمدنی اور قیامت کی مہنگائی۔ پانچ بچوں کو کہاں سے کھلاؤں گا۔"
"ہاں یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ ؎

میں مربیّ نہیں مربّا ہوں
کھائے جاتے ہیں مجھ کو برخوردار"

"پھر سوچتا ہوں کہ یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا تو کیا ہوگا؟"
"کیوں جاری رہے، ضبطِ تولید سے کام لیجئے نا۔"
"آپ کو تو انگریزیت چڑھ گئی ہے۔ ہمارے یہاں تو ضبطِ تولید کا نام لینا بھی معیوب ہے۔"
"خبطِ تولید سے تو ضبطِ تولید بہرحال بہتر ہے۔"

"بہتر کیا ہے بالکل خلاف فطرت"
"قبلہ انسان بڑا فطرتی ہے۔ ان گھڑ حیوانی فطرت کو عقل کے سانچے میں ڈھال کر انسانی فطرت بنا لیتا ہے"
"کچھ بھی ہو ہم سے تو یہ بدعت نہیں ہونے کی"
"تو پھر بدعتِ حسنہ اختیار کیجئے۔ ضبطِ نفس سے کام لیجئے"
"اب وعظ پر اُتر آئے۔ بخشئے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے"
دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا"
"خدا کے لئے دوسرا مصرعہ نہ پڑھئے گا"

۴

۸ر اگست ۶۴۹

"واللہ خاں صاحب، آپ تو آج بالکل ریشہ خطمی ہوئے جا رہے ہیں۔ کیا کوئی شادی کا اشتہار ہے اخبار میں"
"بھئی خوب آئے شیخ جی! میں اس وقت تمھیں کو یاد کر رہا تھا۔ اماں کیا گرما گرم خبر آئی ہے آج کہ جی خوش ہو گیا"
"آخر وہ کون سی ایسی چٹ پٹی مسالے دار خبر ہے کہ آپ کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ رال ٹپکی پڑتی ہے۔ ہمیں بھی تو سناؤ یار"
"انجمن تحفظ حقوق شوہراں، کیا سمجھے؟ یعنی کہ شوہروں کے حقوق

کی حفاظت کی انجمن "۔

"ماشاء اللہ کیا۔۔۔ کی کی ہے۔ مگر سچ سچ اس نام کی کوئی انجمن قائم ہوئی ہے؟"

"جی اور کیا۔ پوری گڑھوال میں۔ اب قدر عافیت معلوم ہو گی ان بیگمات کو۔ آخر ہم بھی بالکل مٹی کے مادھو نہیں ہیں۔ اپنی حفاظت کا بل بوتا رکھتے ہیں"۔

"بل بے تیرا زور! اور یہ سارا زور آزمایا جا رہا ہے بیچاری کمزور عورت پر"۔

"کمزور عورت! یہ تم کس جگ کی باتیں کر رہے ہو؟ میاں یہ چودھویں صدی ہے۔ عورت کو کمزور کہا تو ہتک عزت کا دعویٰ ہو جائے گا۔ خیر بھئی ہم تو چلے گڑھوال، وہی ایک جگہ رہنے کی ہے"۔

"اجی بس رہنے بھی دیجئے۔ ایسے آپ کہاں کے فرہاد خاں ہیں کہ پہاڑوں سے سر ٹکراتے پھریں گے ہم ایک ترکیب بتاتے ہیں۔ آپ خود یو۔ این۔ او کے ماتحت شوہروں کی حفاظت کی ایک انجمن بنا لیجئے اور اس کے صدر بن جائیے"۔

"واللہ کیا بات کہی ہے تو پھر آج ہی سے بسم اللہ ہو جائے نا"۔

"ضرور، مگر یہ تو بتائیے کہ آپ کو کن حقوق کی حفاظت کی ضرورت ہے؟"

"اجی یہی ـــــ یعنی کہ بس یہی ـــــ کہ بیوی بیوی رہے شوہر نہ بن جائے"۔

"یہ تو کچھ بات صاف نہ ہوئی"

"سبحان اللہ! یہاں تو چاند صاف ہوگئی اور آپ کے لئے ابھی تک بات صاف ہی نہیں ہوئی"

"اس صفائی کی داد دیتا ہوں۔ مگر کچھ کہئے تو آخر آپ کو کیا شکائتیں ہیں"

"ارے بھائی مجھ سے کیا پوچھتے ہو، اپنے دل سے پوچھو۔ اس کل جُگ سے پہلے میاں بیوی کا رشتہ کیا مزے کا رشتہ تھا۔ بیوی اپنی بیوی تھی، جب جی چاہا دُلار کیا جب جی چاہا دُھتکار دیا۔ صبح کو ٹھونک دیا، شام کو تھپک دیا۔ مزے میں بسر ہوتی تھی۔ اب تم جیسے لوگوں نے بیوی کو ایسا سر چڑھایا کہ زندگی دشوار ہوگئی۔ گھڑک کر دیکھو تو منہ پُھلا ئے، بُرا بھلا کہو تو بپھر جائے۔ ہاتھ اُٹھاؤ تو قیامت مچا دے اور جو کہیں زرا سا مار دو تو بس پھانسی ہی دلا دے۔ خدا کی پناہ ایسی بیوی سے"

خاں صاحب مجھے اس وقت ایک مطلع یاد آگیا۔ جب زرا افاقہ ہو تو اس کے مطلب پر غور کیجئے گا۔

غضب کے وار تھے تیغ نگاہِ بسمل کے
اماں کے واسطے اُٹھے ہیں ہاتھ قاتل کے

(صالحہ)

۵

۱۶ر اگست ۴۸ء

"اجی بس رہنے دیجیے۔ آزادی۔ قومی حکومت، باز آئے ایسی آزادی سے"

"کیوں خیر تو ہے، بی آزادی بچاری سے آپ کیوں خفا ہو گئے؟"

"خفا نہ ہوں تو کیا ہوں؟ یہ تو ہم مردوں کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اس سے تو وہ غلامی لاکھ درجے اچھی تھی۔ اپنے گھر کے حاکم تھے، عورتوں کے غلام تو نہ تھے۔"

"آخر بات کیا ہے۔ کیا بیوی نے سر سہلا دیا؟"

"یہی حال رہا تو آج نہ سہی کل میں 'آپ' سب مرد جورو کی جوتیاں کھائیں گے۔"

"مجھے تو معاف ہی کیجیے، خدا آپ ہی کو یہ سعادت نصیب کرے۔"

"دیکھ لینا سر پکڑ کر رو دو گے۔"

"ہوا کیا..... آخر کچھ معلوم تو ہو۔"

"تم نے اخبار میں وہ خبر نہیں پڑھی؟ اب سے ہر محکمے میں عورتوں کو مردوں کے برابر نوکریاں ملا کریں گی۔ بھئی ہمارے تو ہاتھوں کے توتے اُڑ گئے۔"

"ہاتھوں کے توتے ہی نہیں معلوم ہوتا ہے وہ چڑیا بھی اُڑ گئی جس کا نام عقل ہے۔"

"آپ کے نزدیک یہ خبر خوفناک نہیں؟"

"ارے میاں یہ تو خوش خبری ہے خوش خبری ..... میاں بھی کمائے بیوی بھی۔ ع

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں ہی نوکر ہیں"

"مگر اس کا نتیجہ؟"

"چھپڑی اور دو دو ...... اس مہنگائی کے زمانے میں اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیئے"

"جی ہاں بیوی کرے گی نوکری اور حضرت بیٹھ کر مسالہ پیسیں گے۔ بچے پالیں گے؟"

"ارے میاں مرد ہی اہل خانہ بن جائیں تو کیا ہرج ہے؟"

"جی اور شاید رفتہ رفتہ بچے بھی مرد ہی پیدا کرنے لگیں گے؟"

"اونہوں۔ این سعادت بزور بازو نیست"

"ذرا سنجیدگی سے سوچو بھائی کہ آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔ ایک تو عورتیں پردہ چھوڑ دیں گی"

"اجی وہ تو پہلے ہی عقل پہ مردوں کی پڑچکا"

"اور پھر دفتر میں ہوا لگی بن گئیں تو بالکل قابو سے باہر ہو جائیں گی"

"یار مجھے دلی ہمدردی ہے تم سے۔ ہائے ہائے اب مرد کس پہ حکومت جتائے گا۔ کیسی بے داموں کی لونڈی اس کے ہاتھوں سے نکلی جارہی ہے"

"نہیں بھائی لونڈی غلام کا کیا ذکر ہے۔ یہ تو انسانی فطرت ہے کہ مرد کما کر لائے اور عورت بچّے پالے گھر کا کام کرے۔"

"انسانی فطرت ہو نہ ہو، مرد کی فطرت ضرور ہے۔ عورت کو ایسے چکر میں ڈالا کہ آزادی کا نام نہ لے۔"

"آخر آزادی لے کر کرے گی کیا؟ اقبال کہہ گئے ہیں کہ عورت کو آزادی کی جگہ زمرد کا گلوبند چاہیئے۔"

"واللہ آپ کو تو ڈبیا میں بند کر کے رکھنا چاہیئے۔ اقبال کہنے والے اور آپ سمجھنے والے۔ اب تو عورت کہتی ہے۔ آزادی میں نے لے لی، زمرد کا گلوبند میاں ہری کنٹھ کو مبارک۔"

"بھائی تم جو چاہو کہو، مگر عورت صدیوں سے چار دیواری کے اندر رہنے کی عادی ہے۔ آزادی اُسے راس نہیں آسکتی۔"

"آپ کے ولی نعمت بھی سو برس تک یہی کہتے رہے کہ ہندوستانی غلامی کی زندگی کے عادی۔ انھیں آزادی راس نہیں آسکتی۔"

"تو کیا جھوٹ تھا؟ دیکھ لو نتیجہ۔"

"سچ ہے۔ ع

ہے سقر موری کے کیڑے کیلئے باغ ارم"

(صالحہ)

۶

۸ ستمبر ۱۹۴۸ء

"ارے بھئی! یہ کیا قصہ ہے؟ میں نے سنا ہے کہ آپ بیاہ رچا رہے ہیں"

"جی، میں کس قابل ہوں، محض دوستوں کا ——"

"مذاق ہے۔ لاحول ولاقوۃ، ایسا مذاق کس کام کا۔ وہی تو میں کہتا تھا کہ یہ سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہونا کیا معنی؟"

"آپ تو بات کاٹ دیتے ہیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ محض دوستوں کا اصرار تھا، جس نے مجبور کر دیا"

"تو سچ ہے، اِنا لِلّٰہِ وانا الیہ راجعون۔ بھلے آدمی یہ عمر شادی کرنے کی ہے؟"

"تو اور کون سی عمر ہوگی، پچاس کے پیٹے میں تو آچکا ہوں"

"کیا خوب سمجھے۔ ارے عقلمند میرا مطلب یہ ہے۔ شادی کا سِن رفت گیا اور بود تھا۔ آپ اب پچاس کے پیٹے میں نہیں۔ ساٹھ کے منہ میں ہیں، اور اس بدنصیب کی کیا عمر ہے؟"

"کس بدنصیب کی؟ یہ آپ کیا باتیں کہہ رہے ہیں!!"

"اس بدنصیب دلہن کی۔ ع

جس کی قسمت میں تھا بوڑھے کی لُگائی ہونا"

"دیکھئے گالیاں نہ دیجئے۔ مجھے غصہ آنے ہی والا ہے۔"

"خیر، ابھی بہت دور ہے، آپ دلہن کی عمر تو بتائیے۔"

"کیسے بتاؤں مجھے تو شرم آتی ہے۔"

"شرم سے پوچھئے، اُس وقت کیوں نہ آئی۔ جب آپ نے اِس پوپلے منہ سے شادی کا پیام دیا تھا۔"

"اس میں شرم کی کون سی بات ہے؟"

"بالکل نہیں، بلکہ سخت بے شرمی کی بات ہے۔"

"بس رہنے دیجئے۔ آپ سے کیا مطلب، آپ کوئی قاضی ہیں؟"

"میں قاضی ہوتا تو آپ کی قضا ہی آجاتی۔ اچھا اب ذرا شرما کر دلہن کی عمر تو بتا دیجئے۔"

"کوئی پندرہ ــــــ"

"یا کہ سولہ کا سن۔ جوانی کی راتیں، مرادوں کے دن۔ اب ذرا یہ بھی بتا دیجئے کہ جب وہ پندرہ دونی تیس برس کی ہوگی تو آپ کا سن شریف کیا ہوگا۔ ساٹھ دونی؟"

"ایک سو بیس، مگر ٹھہریئے تو، یہ کون سا حساب ہے۔ ساٹھ اور پندرہ پچھتر ہی تو ہوئے۔"

"خیر پچھتر ہی سہی، فرض کیجئے۔ پچھتر برس کی عمر میں آپ بن کھلے غنچہ کی طرح مرجھا جائیں تو اس بچاری کو کس پہ چھوڑ جائیے گا؟"

"جی وہ عقد ثانی کرلیں گی۔ شرع میں اجازت ہے۔"

"شرع میں تو سب کچھ ہے مگر تیس برس کی غریب بیوہ سے شادی کرے گا
کون؟ آپ جیسے شیخ فانی بھی تو پندرہ برس کی ڈھونڈھتے ہیں۔"
"خیر اللہ مالک ہے! اسی کے سپرد کر جاؤں گا۔"
"اس کا اللہ مالک" اور آپ کا وہ فرشتہ جسے مالک کہتے ہیں۔ اپنے آپ
کو دوسرے مالک کے سپرد کر دیجیے گا۔ چلئے قصّہ ختم ہوا۔"

۷

۸ دسمبر ۱۹۴۹ء

"لو بی مبارک ہو۔ ہمارے دیس کا آئین بن گیا۔"
"بس رہنے دو اپنی مبارک سلامت، تمھیں تو ہر وقت دیس کی دھن
رہتی ہے، کچھ گھر کی بھی خبر ہے۔ نہ آٹا دال ہے، نہ ڈلی کتھا ہے، چولھا ٹھنڈا
پڑا ہے۔ پاندان اُجڑا ہوا ہے۔ آئے وہاں سے آئین بن گیا۔"
"ہے ہے کیسی بُری فال منہ سے نکالتی ہو، خدا تمھارے پاندان کو
مانگ کوکھ سے ٹھنڈا رکھے۔"
"تمہاری ان مسخرے پن کی باتوں سے میرے تن بدن میں آگ لگ
جاتی ہے۔"
"چلو چولھا گرم ہونے کا سامان تو ہو گیا۔ اب غصّے کو تھوک دو۔ میں
ابھی پاندان اور دیگچی لے جا کر بنئے کے ہاں گروی رکھتا ہوں اور آٹا، دال

ڈلی، کتھا لاتا ہوں۔ مگر پہلے اسمبلی کا ایک لطیفہ سن لو۔ تمھیں میرے سر کی قسم۔"

"سچ کہتی ہوں میں سر پیٹ لوں گی۔ لڑکا مدرسے سے دن بھر کا بھوکا آرہا ہوگا، اور تمھیں لطیفے سوجھ رہے ہیں۔"

"اری نیک بخت آج اخبار کے دفتر سے ساڑھے دس روپے لایا ہوں سمجھیں؟ مبلغ ساڑھے دس روپے، نقد جس کے ادھے سوا پانچ روپے ہوتے ہیں۔ تمھارے لاڈلے لڑکے نے جسے تم بھوکا سمجھ کر غم کھا رہی ہو اٹھنّی راستے ہی میں ہتھیالی اور چاٹ خرید کر کھڑے کھڑے چٹ کر گیا۔ باپ بچارہ وضع دار ٹھہرا۔ بازار میں کیسے کھاتا۔ ہونٹ چاٹ کر رہ گیا۔ چار روپے آسے اور دیئے کر جنس خرید کر لائے۔ چھ روپے جیب میں ہیں۔ کہو اب بھی لطیفہ سنو گی یا نہیں۔"

"کیسے نہ سنوں گی۔ جانتی ہوں کہ جب تک موا لطیفہ حلق میں اٹکا رہے گا نہ تم کو چین آئے گا اور نہ مجھ کو چین لینے دو گے۔ اچھا جلدی سے اگل دو، پھر میں جاکر چولھا جلاؤں۔"

"واہ ری تقدیر! کیا جل ککڑی بیوی ملی ہے۔ لطیفہ اس انداز سے سنیں گی جیسے کنین کا انجکشن لگ رہا ہو۔ خیر تو راوی لکھتا ہے کہ اسمبلی میں کئی دن سے ہمارے آئینی بندوقچی مشت بعد از جنگ کے طور پر دنا دن زنّاٹے کی تقریریں داغ رہے تھے۔ ان میں ایک آسام کی سرما وادی کے سورما ہیں جن کے منہ سے دھواں دھار جوش میں ابلتی ہوئی تقریریں سن کر آتش فشاں کے دہانے کا شبہہ ہوتا ہے مگر اس مرتبہ وہ کچھ ایسے مرنے

میں تھے کہ بس ایک چھوٹی سی پھل جڑی چھوڑنے پر قناعت کی۔ فرماتے ہیں کہ آئین میں گائے اور عورت کی حفاظت کا تو اہتمام کیا گیا ہے۔ مگر گائے اور عورت سے حفاظت کی کوئی تدبیر نہیں کی گئی۔"

"بس یہی لطیفہ تھا جو پیٹ میں نہیں سماتا تھا وہ جوالامکھی سورما بھی تمہارے ہی بھائی ہیں جنھیں گائے جیسی بے زبان اور عورت جیسی بے .... بس ......"

"ہم سمجھ گئے۔ بے لگام کہنا چاہتی ہو۔"

"تمہاری سمجھ پہ اللہ کی سنوار۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ وہ مرد وے کس مٹّی کے بنے ہیں جنھیں گائے جیسی بے زبان اور عورت جیسی بے بس مخلوق سے حفاظت کی ضرورت ہے۔"

"خیر شکر ہے کہ تم نے عورت کی بے زبانی کا دعویٰ نہیں کیا۔ اب رہی بے بسی، یہی تو وہ سان ہے جس پر چڑھنے کے بعد عورت کی زبان میں اس قیامت کی کاٹ آجاتی ہے کہ خدا کی پناہ۔"

"تو کاٹ دو نا اس کی زبان۔ بس اسی کی کسر ہے۔"

"توبہ توبہ! تم بھی کیسی کل جبھی ہو! زبان کاٹنے کا کیا ذکر ہے۔ ہاں اگر ایٹم بم کی نگرانی کے لئے کوئی کمیشن مقرر ہو تو ....."

"تو اسے جوالامکھی کی نگرانی بھی سونپ دی جاتے۔ اچھا اب میری جان چھوڑو مجھے کھانا پکانا ہے تم اپنے دوستوں میں جا کر لطیفے بگھارو۔"

۸

یکم جنوری ۱۹۵۰ء

"آئیے آئیے آپ ہی کا تو انتظار تھا۔ مزاج شریف؟"

"اماں کیا مزاج شریف۔ ایک تو یوں ہی سلگ رہے ہیں اوپر سے تم اور جی جلاتے ہو۔"

"یا اللہ خیر! آج تو مزاج پوچھتے ہی بھڑک اٹھے۔ معلوم ہوتا ہے گھر میں اچھی طرح مزاج پرسی ہوئی ہے۔ آخر بات کیا تھی؟"

"بات کیا ہوتی، وہی کم بخت کوڈ بل کا جھگڑا۔ کوئی گھر ایسا نہیں جس میں اس کی وجہ سے رار نہ مچی ہوئی ہو۔ کہیں میرے منہ سے نکل گیا کہ اگر یہ بل منظور ہوگیا تو عورتیں ہاتھ سے گئیں۔ بس پھر کیا تھا۔ شری متی آئیں تو جائیں کہاں۔"

"اچھا تب ہی ——— خیر اب کیا کہوں۔ دوست کا بھانڈا پھوڑنا اچھا نہیں۔"

"بھانڈا پھوڑنا کیا معنی! کوئی میں نے جوتیاں کھائی ہیں جو تم بھانڈا پھوڑ دو گے؟"

"جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے۔ مگر بھئی کیا دبنگ عورت ہے ہماری بھاوج بھی۔"

"کیا بک رہے ہو تم جیسے آج کل کے داڑھی مونچھ منڈے جورو

کی جوتیاں کھاتے ہوں گے۔ تب ہی تو چار ابرو کے ساتھ چندیا کا بھی صفایا ہو جاتا ہے ہم جیسے مرد بیوی کو لونڈی بنا کر رکھا کرتے ہیں۔"

"وہ تو آپ کی صورت سے معلوم ہوتا ہے۔ واللہ یہ لکھنؤ کے کمہار بھی غضب کرتے ہیں، کیا ساٹھا پاٹھا فر ماکشی مرد بنایا ہے۔ بے شک حضور کی چوکھی نئی نویلی ضرور لونڈی بن کر رہتی ہوگی۔ مگر یہ چندیا والا معاملہ صاف ہو جانا چاہیئے۔ آپ اپنی لٹ پٹی پگڑی اتارئیے۔ میں اپنی گاندھی کیپ اُتارتا ہوں، دیکھیں کس کے بال صاف ہیں۔"

"خیر میں تمہاری طرح بال کی کھال نہیں نکالتا۔ میں تو سیدھی سی بات جانتا ہوں کہ قدرت نے عورت کو مرد کی تابعداری کے لئے پیدا کیا ہے۔"

"کیا سیدھی سی بات ہے جیسے چرخے کا تکلا، کیوں حضرت عورت کو مرد کی تابعداری کے لئے پیدا کیا ہے، اور مرد کو کاہے کے لئے؟ عورت کی چوکیداری کے لئے۔"

"بے شک۔ اگر مرد اپنا چوکیداری کا فرض اچھی طرح انجام دیتا تو یہ نوبت کیوں آتی کہ سڑک، بازار، پارک، جلسہ، پارٹی، کلب، جدھر دیکھئے برقعے چمک رہے ہیں۔ ساڑھیاں پھڑک رہی ہیں۔ سینما جائیے تو وہاں بھی موجود۔ تمھیں انصاف سے کہو کہ یہ مخرب اخلاق فلم ...."

"اس قابل ہیں کہ عورتیں دیکھیں؟ ہرگز نہیں، مگر کیوں حضرت آپ نے کیا اپنے اخلاق کا بیمہ کرا لیا ہے کہ آپ ان مخرب اخلاق فلموں کو بے دھڑک کھلی آنکھوں نگل جاتے ہیں؟"

"ہماری اور بات ہے، ہم مضبوط سیرت رکھتے ہیں۔ عورت کمزور دل و دماغ کی ہوتی ہے۔"

"حضرت قصور معاف ہم نے تو اکثر یہی دیکھا ہے کہ مضبوط سیرت کے مرد بڑی جلدی لڑھکنی کھا جاتے ہیں۔"

"تو تمہارا کیا مطلب ہے کہ مرد پردے میں بیٹھ جائیں۔"

"جی نہیں! میرا مطلب ہے کہ مرد اپنی آنکھ اور زبان کو تہذیب سکھائیں تاکہ عورتیں پردے میں بیٹھنے پر مجبور نہ ہوں۔"

"تم کچھ بھی کہو، مرد مرد ہے اور عورت عورت۔ یہ ابدی حقیقت ہے۔"

"سبحان اللہ کس غضب کی تحقیق کی ہے آپ نے! کیا باون تولے پاؤ رتی کی بات کہی ہے کس کی مجال ہے کہ اس حقیقت سے انکار کرے۔ بے شک مرد مرد ہے، عورت عورت ہے، شرم شرم ہے۔ بے شرمی بے شرمی ہے۔ انصاف انصاف ہے، بے انصافی بے انصافی ہے۔ اگر ان ابدی حقیقتوں کو ہم آپ یاد رکھیں تو پھر سارا جھگڑا ہی مٹ جائے نا۔"

۹

یکم اپریل سنہ ۵۰ء

"اے میں کہتی ہوں یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔ ہونق شکل

بکھرے بال، سوکھے ہونٹ پھٹی آنکھیں جیسے کوئی ہوڑا اچھل خانے سے پھٹ کر آ گیا ہو، میں سمجھی تھی کہ خدا نہ کرے پھر نگوڑی پنڈی ٹیس کا دورہ پڑ گیا ہے۔ مگر یہ چپ جو لگ گئی ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ بس وہ موا خالی خولیا ہے اور کچھ نہیں۔"

"ارے بیگم یہ تم کس وہم میں پڑی ہو، نہ اپنڈی سائٹس ہے نہ مالیخولیا مجھے تو کچھ اور ہی آزار ہے۔ ع
کیا کہوں حالِ دردِ پنہانی"

"لو اور سنو۔ نئے نئے درد نکلتے آتے ہیں۔ اتنی عمر ہو گئی یہ پنہانی کا درد آج تک نہیں سنا تھا۔ آخر کچھ بتاؤ تو سہی یہ پنہانی کہاں ہوتی ہے۔"

"بیگم یہ جسمانی درد نہیں، روحانی کرب ہے۔ تم کیا جانو کہ ایک لیڈر کے دل پہ ملک کا یہ حال زار دیکھ کر کیا گذرتی ہے۔"

"اچھا تو تمھیں لیڈری کے باؤ گولے کا درد اُٹھا ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر یہ ہائے وائے کاہے کی؟ کمر باندھ کر اٹھو اور جا کر دیس کے دکھ کی دوا کرو۔"

"اری نیک بخت ہنسی ٹھٹھا نہیں جان جوکھوں کا معاملہ ہے۔ آدمی بن مانس بن گئے ہیں۔ اپنے بھائیوں کو پھاڑے کھاتے ہیں، جو کوئی انھیں روکے یا سمجھائے، اس کی جان کے لاگو ہو جاتے ہیں۔"

"تو پھر دیس کے درد کا اور لیڈری کا نام ناحق بدنام کرتے ہو صاف صاف کہو نا کہ مرنے کے ڈر سے مرا جاتا ہوں۔"

"تم بھی کیا باتیں کرتی ہو۔ مرنے سے ڈرتے تو تم پر کیوں مرتے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ اپنے کو بھیڑیوں سے نچوا کر کتّے کی موت مرنا اچھا نہیں لگتا۔"

"چلو ہٹو یہ بوڑھے چوچلے رہنے دو، قرینے کی بات کرو، اگر تم سچائی کے لئے مرنے کو کتّے کی موت سمجھتے ہو تو لیڈری کا ڈھونگ نہ رچاؤ۔ کہیں چوہے کا بل ڈھونڈھ کر جا چھپو، اور جو کچھ ہو بلا سے جان تو بچ جائے گی۔"

"ہائے افسوس بیگم تم نے ہمیں آج تک نہ پہچانا۔ اختلاجِ قلب کی اور بات ہے۔ ورنہ ہماری ہمّت کے تو جھنڈے گڑے ہوئے ہیں ہمیں تم ایسا بزدل اور بے حمیت سمجھتی ہو کہ اس خطرناک زمانے میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ ہاں اگر تم بھی ساتھ چلو تو ـــــ"

"تو پاکستان چل کر چین سے کنگلوں کی موت مریں یا بھیک مانگ کر عزت سے بسر کریں۔ دیکھو میں تم سے کہے دیتی ہوں کہ میرے سامنے کہیں آنے جانے کا نام نہ لینا، تم شوق سے جاؤ۔ میں اپنے بچّوں کو لئے یہیں پڑی رہوں گی۔ بندی جس گھر میں پیدا ہوئی ہے اُسے چھوڑ کر جائے گی تو بس خدا ہی کے گھر جائے گی۔ وہ جب تک چاہے گا رکھے گا۔ جب چاہے اُٹھا لے گا۔ بن آئی مرتا نہیں اور آئی سے ڈرنا نہیں۔"

بازار

۱

۲۴ جولائی ۱۹۴۸ء

جی کیا فرمایا آپ نے، گیہوں اور چاولوں کا راشننگ یو۔ پی کے شہروں میں پھر شروع ہونے والا ہے؟ اچھا ہے غریب اور ایمان دار لوگ اب کسی قدر کفایت سے فاقے کریں گے اور امیروں کو پیٹ کی پوجا کے لئے چور بازار کے مندر میں بھینٹ چڑھانی پڑے گی۔"

مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ لوگ مینا بازار کو چور بازار کیوں کہتے ہیں۔ وہاں تو کھلم کھلا مال من مانی قیمتوں پر بکتا ہے اور زائد منافع خیرات میں دیا جاتا ہے۔ جی ہاں خیرات میں۔ ذرا سینئے تو سہی یہ منافع دوکان داروں کے گھر ہی میں تو جاتا ہے نا، اور خیرات انگریزی مثل کے مطابق گھر سے شروع ہوتی ہے۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ من مانے سودے ہمارے آپ کے سامنے

ہوتے ہیں، پولیس کے علم میں ہوتے ہیں۔ پھر یہ چور بازاری کیوں کر ہوئی؟
کیا کہا پولیس کو معلوم ہے تو چالان کیوں نہیں کرتی، رشوت لیتی ہوگی؟
" اجی توبہ کیجئے۔ رشوت کیسی! یہ آپ ۱۵ اگست سے پہلے کی بات
کر رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ پولیس کو جب تک سرکاری طور پہ علم نہ ہو
نجی علم کی بنا پہ کیسے کارروائی کر سکتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ کون
سی عقل اور انصاف کی بات ہے۔ حضرت یہاں عقل اور انصاف کا
کیا ذکر ہے۔ یہ قانون کا معاملہ ہے۔ دیکھئے نا جرمنی میں آج کل یہ مسئلہ
درپیش ہے کہ ہٹلر نازی تھا یا نہیں۔ اس کی جائداد ضبط کریں یا نہ کریں۔
باقاعدہ مقدمہ چل رہا ہے۔ تحقیقات ہو رہی ہے۔ اگر قانونی ثبوت بہم پہنچ
گیا تو فیصلہ ہو جائے گا۔ ورنہ یہ معاملہ بھی قانون کی نظر میں اسی طرح
مشتبہ رہے گا۔ جیسے یہ کہ زلیخا مرد تھا یا ——— نہیں تو نہ، مرد
تھی یا ——— بھئی مطلب یہ ہے آیا زلیخا تھا یا تھی۔
اچھا تو پھر ہم آپ سرکاری طور پہ پولیس کے علم میں کیوں نہیں لاتے؟
آپ کی تو کہہ نہیں سکتے مگر ہمیں دوکان داروں اور آڑھتیوں پہ رحم
آجاتا ہے کہ جیل میں بے چاروں کو اپنی دوکانوں کا ریت ملا آٹا کھانا
پڑے گا اور وہ بھی راشن کی مقدار میں جس سے دوزخ کا ایک کونا
بھی نہیں بھرے گا۔
یہ آپ نے خوب کہی کہ دوکان داروں پہ رحم آتا ہے۔ گاہکوں پہ
کیوں نہیں آتا۔

ارے صاحب رحم ہی تو ہے جس پر آگیا۔ آپ نے وہ قصہ نہیں سنا کہ پیرس میں ایک بچہ اپنی ماں کے ساتھ پکچر گیلری دیکھنے گیا۔ وہاں ایک تصویر تھی جس میں دکھایا گیا تھا کہ روما کے شہنشاہ کے حکم سے کچھ عیسائی شیروں کے آگے ڈال دیئے گئے ہیں اور شیر انھیں کھا رہے ہیں بچہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ماں نے اسے بہلانا چاہا کہ یہ فرضی تصویر ہے کوئی شیروں نے سچ مچ عیسائیوں کو تھوڑا ہی کھایا تھا۔ بچّے نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا "اماں — مجھے — مجھے — تو — اس بے — چارے — شیر پر — رونا آتا ہے ...... جو اس کونے میں — کھڑا — حسرت کی نظروں سے تک رہا ہے — اور — اور — اس — کے — پاس — کوئی — عیسائی — کھانے — کو — نہیں۔"

۲

۲۴ اگست ۴۸ء

"اے حضرت آپ کو ملکی معاملات سے تو بڑی دلچسپی ہے۔ گھنٹوں بیٹھے اخبارات چاٹا کرتے ہیں، پہر پہروں تک ہمارا مغز چاٹتے ہیں، ذرا یہ تو بتایئے کہ یہ بھائے، شکر، بالائی، افیم، تمباکو غرض یہ کہ ضرورت کی ہر چیز کو جو آگ لگی ہوئی ہے۔ دن پر دن بھاؤ بڑھتا چلا جاتا ہے

اس کی کیا لم ہے؟"

"بھئی واہ مرزا صاحب ضرورت کی چیزوں کی فہرست خوب بتائی مگر یہ بٹیر، کبوتر، پتنگ، ڈور کیوں چھوڑ دیا؟"

"بے پر کی نہ اڑائیے، جو پوچھا ہے اس کا جواب دیجئے۔ بندے نے بھی منطق پڑھی ہے کچھ گھاس نہیں کھودی؟"

"واللہ گھاس کھودتے تو مزے میں رہتے۔ منطق سے کوئی پیٹ بھرتا ہے؟"

"غرض آپ فقروں میں ٹالیں گے، بتائیں گے نہیں؟"

"نہیں حضرت آپ سے کیا چھپانا ہے۔ بات یہ ہے کہ مہنگائی یا تو چیزوں کی کمی سے ہوتی ہے یا زر کی بہتات سے؟"

"زر کی بہتات سے مہنگائی؟ کیوں دل لگی کرتے ہو؟"

"دل لگی کی ایک ہی کہی، یہ تو ایک ابتدائی معاشی اصول ہے؟"

"اب میں اس معاشی کو کیا کہوں۔ مگر آپ سے قسم دیکر پوچھتا ہوں کہ زر کی بہتات کس بھکوے کے پاس ہے؟ اللہ ہی جانتا ہے کس طرح رد رد کے خرچ چلتا ہے؟"

"مرزا صاحب آپ کے پاس بہتات نہیں تو کیا کسی کے پاس نہیں؟"

"یوں ہونے کو تو لوگوں کے پاس اتنا ہے کہ رکھنے کو جگہ نہیں۔ لڑائی کے زمانے میں الغاروں کمایا ہے۔ مگر ان لوگوں کے لئے مہنگائی کہاں، انھیں تو ہر چیز مفت معلوم ہوتی ہے۔ خوب دل کھول کر خریدتے ہیں"

"ان لوگوں کی وجہ سے مانگ ہوئی زیادہ اور چیزوں کی پیداوار ہوئی کم۔ کاہے سے جنگ کی تباہیوں سے۔ پھر بھاؤ بڑھیں یا نہ بڑھیں؟"

"اچھا تو آپ کا یہ مطلب ہے کہ دوسروں کے پاس زر کی بہتات ہو تو ہمارے لئے اس کا نتیجہ مہنگائی ہے؟"

"جی یہی مطلب ہے۔"

"بھئی معاف کیجئے میں سمجھا نہ تھا، آپ سچے اور آپ کی معاشی سچّی۔

ع۔ ہمیں جھوٹے سہی اس بات کا جھگڑا کیا ہے"

۳

یکم اکتوبر ۱۹۴۷ء

"لالہ جی بندگی۔"

"بندگی سرکار بندگی۔"

"کہئے مزاج اچھے ہیں۔"

"جی رہے ہیں سرکار۔ آپ کی جان و مال کو دعا دیتے ہیں۔"

"لالہ اب یہ سرکار درکار چھوڑو۔ اب دیس آزاد ہو گیا ہے۔"

"اے تو کیا ہوا سرکار، پہلے وساوری سرکار رہتی۔ اب دیسی ہے۔"

ارے بھئی سرکار تو منتری منڈل ہے۔ ہم تو معمولی ملازم ہیں۔"

"آپ اور وہ الگ الگ تھوڑی ہیں، وہ تھوک سرکار آپ پھٹکل سرکار۔"

"تھوک اور پھٹکل میں بڑا فرق ہوتا ہے لالہ۔"

"فرق یہی ہوتا ہے سرکار کہ پھٹکل تھوک سے ذرا مہنگا پڑتا ہے۔"

"کہہ گئے نقرہ، مگر یہ تو تمہیں ماننا ہی پڑے گا کہ اصل سرکار وہی ہے جسے تم تھوک سرکار کہتے ہو۔"

"نہیں سرکار کروروں گاہکوں کے لئے تو اصل چیز پھٹکل ہی ہے مٹھی بھر آڑھتیوں کو چھوڑ کر دیکھئے تو تھوک سے کسی کو کیا لینا ہے۔"

"ارے یہ سب کہنے کی باتیں ہیں لالہ۔ ہمیں تو اب کوئی کوڑی کو بھی نہیں پوچھتا۔ ہر گنوار جو کانگریس کا ممبر بن گیا ہے۔ ہمیں سلام کرنے کی جگہ یہ چاہتا ہے کہ اُلٹے ہم اسے سلام کریں۔"

"تو سلام کر لیا کرو سرکار۔ اس میں کون سا ٹوٹا ہوتا ہے؟"

"تمہیں بس ٹوٹے کی فکر ہے، ارے عزّت بھی کوئی چیز ہے؟"

"کیوں نہیں سرکار۔ عزّت بہت بڑی رقم ہے۔ ہمارے ہاں اس کا کھاتہ الگ رہتا ہے۔"

"لو اور سنو، کل کو تم کہوگے کہ اس کا لین دین بھی ہوتا ہے۔"

"وہ تو ہوتا ہی ہے سرکار۔ پر اس کے دو ڈھنگ ہیں۔ ایک بانکپن کا جس میں عزّت لیتے ہیں اور عزّت دیتے ہیں۔ دوسرا بنئے پن کا جس میں عزّت کرتے ہیں اور عزّت پاتے ہیں۔"

"بانکپن کا ڈھنگ تو خوب معلوم ہے۔ ذرا بنئے پن والا سمجھا دو۔"

"دیکھئے سرکار جیسے آپ روز اکڑتے ہوئے بنئے کی دوکان کے سامنے سے نکلیں۔ وہ آپ کو دیکھتے ہی کھڑا ہو جائے اور جھک کر سلام کرے تو آپ یہ کہیں گے کہ اس کی گرہ سے عزّت جا رہی ہے۔ چلئے ٹھیک ہے۔ اب ایک دن آپ رُکتے جھجکتے ہچکچاتے ہوئے آتے ہیں اور لڑکھڑاتی زبان سے کہتے ہیں۔ لالہ جی بندگی، بھئی ایک پچاس روپے کی ضرورت ہے۔ تنخواہ پر دے دوں گا۔ بنیا ہاتھ اٹھا کر دیتا ہے اور آپ ہاتھ پھیلا کر لیتے ہیں۔ کہئے بنئے کے پاس ساری عزّت بیاج سمیت واپس آگئی یا نہیں۔"

"بھئی لالہ خوب کہتے ہو، مگر عجیب اتفاق ہے مجھے واقعی اس وقت ——"

"ایک پچاس روپے کی ضرورت ہے؟"

"نہیں توبہ! پچاس روپے کیسے ———— صرف پچیس روپے کی۔"

۴

۲۴ راکتوبر ۱۹۴۹ء

"کہئے میر صاحب مزاج اچھے ہیں۔"

"مزاج تو آج کل کسی بے حس، بے حیا کے اچھے ہوں گے۔ بس یوں سمجھ لو کہ جی رہے ہیں۔"

"اجی آپ کیا کسی سے کم ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات ہے کہ جیئے چلے جاتے ہیں۔"

"مطلب یہ ہے کہ ہم بھی بے حیائی میں کسی سے کم نہیں۔ صاف کہو نا، لگی لپٹی کیوں رہے۔"

"کیا مجال بھلا میں نقل کفر کر سکتا ہوں۔"

"شاباش کافر بھی بنا دیا۔ اور جو کچھ کہنا ہو کہہ لو۔"

"توبہ میر صاحب! آپ تو بال کی کھال نکالتے ہیں۔ مگر آخر بات کیا ہے۔ آج اتنی بیزاری کیوں ہے؟"

"بیزاری نہ ہو تو کیا ہو؟ بی مہنگائی اور میاں کنٹرول کی بدولت دنیا کی نعمتوں سے ہاتھ دھو یا۔ مٹھائی چھوٹی، پھل چھوٹے، گھی چھوٹا۔ مکھن چھوٹا ——"

"اور دودھ چھوٹا۔"

"لاحول ولا قوۃ! چاہے بات کرنا نہ آئے۔ مگر بیچ میں لقمہ ضرور دیں گے، دودھ بچوں کا چھوٹتا ہے یا ہم جیسے بوڑھوں کا۔"

"مگر میر صاحب جب دودھ عنقا ہو جائے اور آپ جیسے بوڑھے دودھ کے لئے ترسیں تو اس مطلب کو کس طرح ادا کیا جائے۔"

"پھر وہی ہڑکنا۔ عامیانہ لفظ۔ یوں کہو کہ دودھ تو اب چڑیا کا

دودھ ہوگیا۔"

"واہ میر صاحب ہمیں تو عامیانہ لفظ پر ٹوکتے ہیں اور آپ سوقیانہ فقرہ کہہ گئے۔ اچھا، اب یہ بتائیے کہ جن نعمتوں کا آپ نے ذکر کیا وہ تو سب پہلے ہی چھوٹ گئی تھیں۔ اب نئی مصیبت کون سی آئی جس سے چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔"

"ہائے ہائے تمہیں کبھی تمیز نہ آئے گی، خیر میں کہہ یہ رہا تھا کہ لے دے کے ایک چائے رہ گئی تھی۔ اب اس کے بھی چھوٹنے کی نوبت آگئی چائے کا مزا شکر سے ہے اور شکر اب نصیب دشمناں ہوگئی۔ جو دھکے کھائے۔ لاٹھیاں اور گولیاں کھانے کا جوکھم اُٹھائے۔ وہ کنٹرول کی شکر لانے کا حوصلہ کرے۔"

"ارے! اب سمجھا کہ آپ اتنے کڑوے کیوں ہو رہے ہیں۔ نئی طبی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ جسم میں شکر کی کمی ہو تو آدمی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔"

"تمہیں واللہ سچ بتاؤ، کہیں مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟"

"توبہ میر صاحب بھلا شکر کے معاملے میں مذاق کا کیا کام۔ آپ جس سائنس داں سے چاہیے پوچھ لیجئے۔ اور آپ خود دیکھئے نا۔ جب سے شکر کا توڑا ہوا ہے، ہندوستان اور پاکستان میں لوگ کتنے جھگڑالو ہو گئے ہیں۔ بھائی بھائی سے، دوست دوست سے لڑ رہا ہے کہیں مسدوٹ اور دولتانہ میں گتھم گتھا ہے۔ کہیں لوندخور اور مردم خور میں، کہیں راجا اور پرکاشم میں، کہیں بھارگو اور سچر میں اور ابھی ہم دونوں

میں جھوڑ ہوتے ہوتے رہ گئی!"

"بھئی کچھ سمجھ میں نہیں آتا جب ایسی بات ہے تو پھر ہماری دیسی سرکار وساور سے شکر کے جہاز بھر بھر کے کیوں نہیں منگاتی کہ ان مل والوں اور آڑھتیوں کا مزاج درست ہو جائے اور انھیں جھک مار کر شکر سستی کرنی پڑے۔"

"زرا کان اِدھر لایئے تو کہوں۔ دیکھئے بڑے راز کی بات ہے اپنوں ہی تک رہے۔ قصّہ یہ ہے میر صاحب کہ ہماری تو ساری بدیسی پالیسی شکر میں لپٹی ہوئی ہے۔ بتایئے ہم نے سب سے پہلے دوستی کا رشتہ کس سے جوڑا؟ آسٹریلیا سے۔ پھر؟ انڈونیشیا سے۔ اس کے بعد ہتھنی بھیجکر کسے پرچایا؟ جاپان کو۔ یہ تینوں ملک بس یوں سمجھئے کہ شکر کی کان ہیں۔ اب تک ہم اپنے دیس کے شکر چوٹوں کو ڈھیل دیتے رہے کہ شاید راہ پر آجائیں۔ لیکن اگر یہ اسی طرح شکر حرامی کرتے رہے تو اپنے ہم شکر ملکوں کی مدد سے ان کو بیرونی مقابلے کے کولھو میں رکھ کر ایسا پیلیں گے کہ رس نکل آئے گا۔"

"دیکھو اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو تمہارے منہ میں گھی شکر ورنہ پھر۔ ؏

چھوٹے کے منہ میں آ گئے کہوں کیا۔"

۵

۱۶ر جنوری سنہ ۱۹۵۰ء

" بھئی خوب آئے میر صاحب۔ یہ دیکھئے گرما گرم دھواں دھار چائے ابھی ابھی بن کر آئی ہے۔ مگر نمک کی پینی پڑے گی اُستاد۔ شکر کی تو آپ جانتے ہیں برکت ہی برکت ہے۔ ہاں جیب میں آپ پڑیا رکھ لائے ہوں تو اور بات ہے "

" خدا نہ کرے نصیب دشمناں۔ میرے پاس شکر کیوں ہوتی۔ مجھے بھی کوئی چور بازار کا چودھری مقرر کیا ہے "

" توبہ کیجئے۔ چودھری چور بازار گیا چولھے میں، ہم آپ کو ملا شور بازار سمجھتے ہیں تو آیئے پھر نمک کی چائے نوش فرمایئے۔

" نہ بھائی نمک کی ہم سے نہ پی جائے گی۔ شیخ کشمیر کی تقلید تم ہی کو مبارک ہو۔ ہم تو شیخ اڑیسہ کے پیرو ہیں۔ جب سے شکر ناپید ہوئی ہے کلھیا میں گڑ پھوڑ لیا کرتے ہیں "

" واللہ بڑا ظرف ہے آپ کا میر صاحب، آپ کو اس کی پروا نہیں کہ گڑ کی چائے پر لوگ فقرے کسیں گے "

" اجی ہم خود حرفوں کے بنے ہوئے ہیں، ہمیں فقروں کا کیا ڈر ہے "

" اچھا میر صاحب۔ آپ تو بڑے دوربین بلکہ سیر بین ہیں۔ یہ بتایئے کہ کھانے پینے کی چیزوں کا یہ توڑا کبھی ختم بھی ہوگا یا نہیں "

"آخر ختم ہو تو کیسے ہو۔ ہمارے چھوٹے بڑے منجھولے نیتا سب ہی کہہ رہے ہیں کہ پیداوار بڑھاؤ۔ ہم بھی چیختے چیختے تھک گئے۔ مگر بی جنتا ہیں کہ سنتی ہی نہیں۔"

"میر صاحب چیخنے سے کیا ہوتا ہے۔ آپ لوگ کر کے دکھایئے تو جنتا پر کچھ اثر بھی ہو۔"

"لو اور سنو بھلا ہم کس چیز کی پیداوار بڑھائیں۔ ہم تو بس بچے پیدا کر سکتے ہیں۔"

"یہ شکمی کاشت تو ماشاءاللہ آپ کے ہاں بڑے زور و شور سے ہو رہی ہے۔ مگر ضرورت بچوں کی نہیں چیزوں کی پیداوار بڑھانے کی ہے۔ اس کی کوئی چلتی ہوئی ترکیب نکالئے تو سرکار آپ کو نیشنل پلاننگ کمیٹی کا پردھان بنا دے گی۔"

"ارے میاں ہم کو کون پوچھتا ہے۔ اگر ہم سے رائے لی جاتی تو آج کو یہ ہائے ہائے کیوں ہوتی، وہ ترکیب بتاتے کہ ساری مشکل چٹکی بجاتے حل ہو جاتی۔"

"تو بتایئے نا میر صاحب۔ کچھ معلوم تو ہو کہ وہ کون سا جادو کا عمل ہے؟"

"اچھا تو لو تم بھی کیا یاد کرو گے۔ ہماری سرکار نے کھیتوں اور کارخانوں کی پیداوار بڑھانے کے لئے پن بجلی کی بڑی بڑی اسکیمیں بنائی ہیں مگر اس پردھیان نہیں دیا کہ ہمارے پاس طاقت کا ایک اتھاہ قومی

خزانہ ہے جو بے کار خرچ ہو رہا ہے بلکہ آنکھ بند کر کے لٹایا جا رہا ہے۔ اگر اس طاقت کو جوت کر اس سے کام لیا جائے تو نہ جانے کتنے کارخانے ٹیوب ویل اور پن بمبے چل سکتے ہیں۔ بھلا بوجھو تو وہ کون سی طاقت ہے؟ ــــ بس رہ گئے؟ سنو وہ اس بھاپ کی طاقت ہے جو ہمارے گورنروں منتریوں، مرکز اور صوبوں کی کونسل کے ممبروں اور لاکھوں نیتاؤں، سدھارکوں اور پرچارکوں کی گرما گرم دھواں دھار تقریروں سے پیدا ہوتی ہے۔ فقط ایک مرکزی اسمبلی میں بھاپ کا وہ زور ہوتا ہے کہ اگر دروازے کھلے ہوئے نہ ہوں تو اسمبلی کی عمارت کا گنبد اس طرح اڑ جائے جیسے کبھی کبھی اُبلتی ہوئی ہنڈیا کی چپنی اڑ جاتی ہے، تم خود سوچو کہ ایک انجن کی بھاپ سے پوری کھچا کھچ بھری ہوئی ریل گاڑی چلتی ہے تو کیا اتنے انجنوں کی بھاپ اکٹھا کر کے دیس کی گاڑی نہیں چلائی جا سکتی۔ مگر افسوس ہے اتنے قیمتی دماغوں اور پھیپھڑوں کی طاقت سے جو الغاروں بھاپ پیدا ہوتی ہے۔ اس سے صرف بل پاس کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ جس کے لئے ایک پھونک کافی ہے۔ بولو میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟"

"سچ اور جھوٹ تو اللہ جانے۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ آپ نے جو کچھ کہا بہت خوب کہا۔ اب ایک کام کیجئے۔ شری گیڈ گل کو اپنی یہ رائے لکھ کر بھیج دیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ آپ جیسے دیس کے سچے بھاپ خواہ کی دل سے قدر کریں گے۔"

۶

یکم مارچ ۱۹۵۰ء

"سنا آپ نے میر صاحب۔ اس ستم ظریفی کو دیکھئے گا۔ اقوام متحدہ کے غذائی اور زراعتی ادارے کی کانفرنس کے لئے لکھنؤ جیسا شہر تجویز کیا گیا۔"

"ٹھہریئے گا حضت۔ یہ لکھنو جیسا کیا معنی۔ آپ دہلی کی بولی کب سے بولنے لگے۔ ہم اہلِ زبان ایسے موقع پر جیسا نہیں بلکہ ایسا کہتے ہیں۔"

"ذرا زبان روک کے قبلہ! ہمیں بھی آپ نے کوئی ایسا ویسا سمجھا ہے۔ بھلا ہم جیسے کی جگہ ایسا کیسے کہہ دیں۔ جیسا عمر بھر کہتے آئے ہیں ویسا ہی کہیں گے۔"

"سچ ہے جیسے کو تیسا۔ اب سے کان پکڑے کہ زبان کے معاملے میں اہل یا نا اہل کسی سے نہیں اُلجھیں گے۔ مگر یہ تو بتایئے۔ یہ کھیت کھلیان کی کانفرنس جس کا آپ ذکر کر رہے ہیں۔ ہے کیا چیز؟ اور اگر ہمارے شہر میں ہو رہی ہے تو اس میں ستم ظریفی کیا ہے۔"

"بات یہ ہے کہ میر صاحب لڑائی کے بعد دنیا میں غذا کا ہوا توڑا اور لوگ کرنے لگے فاقے۔ یارانِ طریقت کو، جو شہر کے اندیشے میں دُبلے ہیں، یہ فکر پیدا ہوئی کہ بھئی یہ تو ٹھیک نہیں، اگر خلقت فاقوں مر گئی تو ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کس پہ آزمائے جائیں گے مگر اب کریں تو کیا کریں؟ غذا کی

پیداوار بڑھتے بڑھتے بڑھے گی۔ تب تک بھوکوں کا پیٹ کیسے بھرے؟
مگر کیا کہنا ہے سیاست دانوں کے دماغ کا۔ آخر ایسی تدبیر ڈھونڈھ نکالی
کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ انھوں نے سوچا

جانور فربہ شود از نائے و نوش
آدمی فربہ شود از راہِ گوش

جب تک لوگوں کو روٹی کی کمی ہے۔ روٹی کے بارے میں لکچر پلائے
جاؤ۔ چنانچہ یہ سمیتی جسے آپ نے کھیت کھلیان کانفرنس کہا استھاپت
کر ڈالی۔ اب اس کی بیٹھک باری باری سے ہر دیس میں ہوتی رہتی ہے
اور بیٹھک باز لفظوں کا اتنا بڑا انبار لگا دیتے ہیں جن سے لوگوں کا پیٹ
ناک تک بھر جاتا ہے۔"

"اچھا صاحب یہ تو سمجھ گئے مگر وہ ستم ظریفی والی بات رہ گئی۔"

"ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ دیر ہضم کانفرنس، جیسے مویشی وغیرہ کی نمائش
نے اور بھی ثقیل بنا دیا ہے۔ لکھنو جیسے (یا ایسے یا ویسے) شہر میں ہو۔ ہی
ہے۔ جس کا ہاضمہ اتنا نازک ہے کہ کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں پچتی۔ بس
ہوا پھانکتا ہے اور حقہ پیتا ہے۔ یہ ذکر ہم نے اس لئے چھیڑا کہ آج ہم
بھی ادھر جا نکلے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر مقرروں کی تقریریں جو سُنیں تو
بس کچھ نہ پوچھئے کہ کیا حال ہوا۔ پیٹ میں نفخ، سینے میں جلن، آنتوں
میں قراقر، کھٹی ڈکاریں۔ ہم نے اپنے دل میں کہا۔ جب ہم دیہاتیوں
کی یہ کیفیت ہے تو شہر والوں پر کیا گزرے گی۔ مگر خدا بھلا کرے اس

مصری ڈاکٹر کا، ایسا مسہل دیا کہ ساری کسر نکل گئی۔ جی باغ باغ ہو گیا۔"

"وہ کیا شے تھی حضرت۔ ہمیں بھی اس کا نسخہ بتا دیجئے۔"

"کیا بتاؤں قبلہ۔ اس نے اس ذوق و شوق سے عشق کا ترانہ چھیڑا کہ خشک اور بے رنگ مجلس کا رنگ ہی بدل دیا۔ پہلے اس نے ایک آہِ سرد کھینچی اور پھر کہنا شروع کیا۔

سرگذشتِ بلا کشاں نہ سنو
نہ سنو میری داستاں نہ سنو

حضرات میں کس زبان سے اپنا دردِ دل آپ کو سناؤں اور آپ کس دل سے سُنیں گے۔ آنے کو تو میں آ گیا مگر اس نازنیں کی یاد جسے وہاں چھوڑ کر آیا ہوں۔ دم بھر چین نہیں لینے دیتی۔ آہ وہ اس کا گداز بدن، وہ نقرئی جلد، وہ چوڑا ماتھا۔ وہ بڑی بڑی معصوم آنکھیں اور

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن

وہ حسین نہ سہی مگر اس کی اُٹھتی جوانی، اس کی بھولی ادائیں، اس کی الھڑ چال۔ اس غضب کی کشش رکھتی ہے کہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ ہائے میری امینہ میری روح کی راحت۔ میرے دل کا چین۔

حضرات، بس میں اس کی ایک صفت اور بیان کروں گا۔ جسے سن کر آپ کے منہ میں پانی بھر آئے گا۔ وہ ہر فصل میں کوئی سو من دودھ دیتی ہے اور کیسا گاڑھا اور چکنا دودھ کہ بغیر متھانی کے انگلیوں سے مکھن نکال لو۔

پہلے تو مجلس میں سناٹا تھا۔ ہمارے جیسے ثقہ سامعین دم بخود چیں بہ جبیں۔ بے چینی سے بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ مگر ٹیپ کا بند سُن کر سارا مجمع لوٹ لوٹ گیا۔"

"بھئی واللہ لطف آگیا۔ واہ رے مصری کیا کہنے ہیں! بہ قول حیدر آبادیوں کے خوب مسکا لگایا۔"

۷

۲۴ / اپریل ۱۹۵۰ء

اس میں شک نہیں کہ یونان کے حکیم بھی بڑے بے ڈھب ہوتے تھے۔ اب آپ دیکھئے نا کہ حکیم سقراط صاحب زہر کا پیالہ غٹ غٹ چڑھا گئے اور منہ بنانا تو درکنار ایک الائچی تک بھی تو نہ کھائی کہ ذرا منہ کا مزا ہی بدل جاتا۔ ایک ہمارے حکیم صاحبان ہیں کہ دوسروں کو تو زہر کے قدحے کے قدحے پلا دیں اور خود یہ حال کہ بخار کی شدت سے نزع کے عالم میں ہوں اور کوئی کہے کہ حضرت بسم اللہ گلوئے تازہ، شاہترہ چرائتہ، خیسانده، جوشانده صاف نمودہ بنوشند تو سُنتے ہی دم نکل جائے۔ خیر تو ہم آپ کو یونان کے ایک حکیم ارشمیدس کا قصہ سناتے ہیں جس نے سقراط سے بھی بڑھ کر جرأت حکیمانہ سے کام لیا۔

ہوا یہ کہ یونان میں ایک سنار تھا اور

ایک دختر تھی اس کی ماہِ جبیں
شادی جس کی نہیں ہوئی تھی کہیں

ظاہر ہے شادی ہوتی کیسے۔ کپڑے کا تھا راشن اور جہیز کے لئے کچھ نہیں تو اکیس جوڑے تو ہونے ہی چاہئیں تھے چور بازار سے اتنا کپڑا خریدنے کے لئے مع مبالغہ مارشل ایڈ کی رقم درکار تھی اور وہ سنار کے مقدور سے باہر تھی۔ آخر اس نے یہ تدبیر سوچی کہ ایک بڑا خوب صورت سونے کا تاج بنایا جس میں سونا کم اور دونا زیادہ تھا۔ وہ تاج بادشاہ کے پاس لے جاکر سنار نے یہ مصلحت آمیز دعویٰ کیا کہ وہ خالص کندن کا بنا ہوا ہے۔ بادشاہ تھا بہ کارِ خویش ہشیار۔ اس نے سوچا کہ اگر سنار کا دعویٰ مان لیا تو ساری مارشل ایڈ تاج کی قیمت میں چلی جائے گی۔ پھر کمیونسٹوں سے لڑنے کے لئے سامانِ جنگ کاہے سے خریدا جائے گا اور اگر نہ مانا تو ایسی خوب صورت چیز کو توڑ کر یا گلا کر دیکھنا پڑے گا۔ اس نے حکیم ارشمیدس کو بلا کر کہا "حکیم جی کوئی ایسی جگت لڑاؤ کہ تاج بھی صحیح سلامت رہے اور کھرے کھوٹے کا امتحان بھی ہو جائے۔"

اس کے بعد راوی کہتا ہے کہ اس فکر میں حکیم جی کا کھانا پینا سونا چھوٹ گیا مگر فکر ہے کہ نہانا نہیں چھوٹا۔ بہر حال ایک دن وہ ننگ دھڑنگ نہانے کے ٹب میں داخل ہوئے تو بس کچھ نہ پوچھئے۔ ایک دم سے حال آگیا۔ ایک چھلانگ میں ٹب سے باہر آکر بغیر کپڑے پہنے (گویا نئے ادب کے جامے میں) گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک

بے خودی کے عالم میں رقص فرماتے اور یہ نعرہ لگاتے چلے جا رہے تھے۔

"ڈھونڈھ لی! ڈھونڈھ لی"

اب یہ ستم دیکھئے لوگ اس مجذوبانہ حرکت کی تاویل کیسی کثیف کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ بھرے ٹب میں بیٹھنے سے پانی جو چھلکا تو حکیم کا ذہن کثافت نوعی کے مسئلے کی طرف متوجہ ہو گیا اور اسے یہ بات سوجھ گئی ہر دھات کی مقررہ مقدار پانی کی ایک مقررہ مقدار کو چھلکائے گی اور اگر تاج کو اور اس کے ہم وزن خالص سونے کو بھرے پانی کے پیالے میں ڈال کر ایک تجربہ کیا جائے تو اس کا کھرا کھوٹا ہونا معلوم ہو جائے گا۔

بھلا اس کو کون مانے گا کہ ارشمیدس جیسا جید حکیم کثافت نوعی کے سیدھے سادھے اصول کو دریافت کرنے کے لئے کئی دن دریائے فکر میں غوطے کھاتا رہا تو کچھ نتیجہ نہ نکلا اور ٹب میں بیٹھتے ہی بات کی تہہ کو پہنچ گیا؟ اور پھر یہ کون سی ایسی بڑی بات تھی جس پر حکیم جی ریشہ خطمی ہو گئے؟

سچ یہ ہے غریب اگلے زمانے والے تاریخ کی معاشی تعبیر کیا جانیں انھیں کیا خبر کہ ارشمیدس در اصل اس ادھیڑ بن میں تھا کہ راشن کے زمانے میں کپڑے کا مسئلہ جس کی وجہ سے سنار کو سونے میں ملاوٹ کرنی پڑی، کیسے حل ہو۔ آخر اس پر یہ القا ہوا کہ

تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس

یہ تھی وہ زبردست حقیقت جس کے ڈھونڈھ نکالنے پر ارشمیدس فرط مسرت کے جوش میں آپے سے باہر ہو گیا، اور یہ محض مجذوبانہ حرکت نہ تھی بلکہ

عام زندگی

اس عالم باعمل نے مسئلے کا مجسم حل بن کر دکھا دیا۔

۱

یکم دسمبر ۱۹۴۸ء

"آیئے آیئے میر صاحب اب تو مہینوں کیا برسوں آپ کی صورت نظر نہیں آتی۔ پہلے آپ کو عید کا چاند کہتے تھے۔ اب دم دار ستارہ کہنا پڑے گا۔"

"یہ دم دار ستارہ کیا معنی؟ جو منہ میں آتا ہے بک دیتے ہو۔ دیکھتے نہیں کہ ایک تو محاورہ غلط ہے۔ دوسرے اس میں ذم کا پہلو نکلتا ہے۔"

"ارے توبہ معاف کیجئے گا، میں نے محاورہ سمجھ کر نہیں استعارہ سمجھ کر کہا تھا۔ مگر بڑا غضب تو یہ ہوا کہ ذم کا پہلو نکل آیا۔ اب کیا ہوگا! ذرا اچھی طرح دیکھ لیجئے کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو دھوکا ہوگیا ہو۔"

"دھوکا کیا ہوتا، کھلی ہوئی بات ہے، ایک تو دم دار یوں ہی قبیح ہے اور پھر دم دار ستارے میں تو قباحت کے علاوہ نحوست بھی آگئی۔"

"قباحت کو تو خیر صبر کر لیجئے۔ مشیّتِ ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ مگر یہ نحوست آپ کی میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"پھر وہی شرارت کی باتیں۔ میری نحوست کا ذکر ہے یا دمدار ستارے کی؟"

"توبہ کیجئے میر صاحب۔ میری کیا مجال کہ آپ کی نحوست کو کچھ کہوں میں تو دم دار ستارے کی نحوست سے انکار کر رہا ہوں۔"

"تمہارا کیا ہے۔ تم تو شیطان کی شیطنت سے بھی انکار کر دوگے۔ غضب خدا کا صریحاً دیکھ رہے ہو کہ ادھر دم دار ستارہ نکلا، اُدھر بمبئی پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ طوفان آیا۔ وہ طوفان آیا کہ بس خدا کی پناہ اور پھر بھی اس منحوس ستارے کی نحوست سے انکار کرتے ہو۔"

"قربان جایئے آپ کے اس بھولے پن کے۔ بمبئی کا طوفان آپ کے خیال میں دم دار ستارے کا دم چھلّا تھا۔ ستارہ تو ساری دنیا میں دیکھا گیا اور اس کی نحوست کی تان صرف بمبئی پر آکر ٹوٹی۔ اور یہ جو ہندوستان اور پاکستان میں ایک کروڑ آدمیوں پر خانہ بربادی کی قیامت ٹوٹی اور اب چالیس کروڑ آدمیوں پر مہنگائی اور بھوک کی قیامت ٹوٹ رہی ہے اور یہ جو یورپ کے اوپر جنگ کی قیامت ٹوٹی اور اب کومن فارم اور مارشل ایڈ کی قیامت ٹوٹ رہی ہے اسے بھی آپ دمدار ستارے کی نحوست کہیں گے۔"

"تو پھر کیا کہوں؟"

"اپنے اعمال کی شامت کہئے، اپنی حماقت، جہالت اور وحشت کہئے وہ دن گئے۔ جب انسان اپنے کرتوت شیطان کے سر منڈھ دیا کرتا تھا یا دم دار ستارے کی دم سے باندھ دیا کرتا تھا، اب قانون اور آئین کا زمانہ ہے۔ سوچ سمجھ کر چونچ کھولنا چاہئے اگر آپ نے شیطان پر یا دم دار ستارے پر ایسے بے سر و پا الزام لگائے تو یو۔این۔او میں نالش کر دیں گے اور چودھری ظفر اللہ کو اپنا وکیل بنا لیں گے۔ بیٹھے بٹھائے آپ کے اوپر کمیشن بیٹھ گیا تو پھر کیا کیجے گا"

"تم تو ہو مسخرے اور مجھے مسخرے پن سے چڑ ہے۔ اسی لئے تم سے ملتے ہوئے گھبراتا ہوں"

"یوں کہئے نا ع

تو ہے ہنسوڑ اور میں ہوں مقطع میرا تیرا میل نہیں"

۳

۱۶ / دسمبر ۱۹۴۸ء

(ا، ب ریل میں انٹر کے ایک ڈبے میں سفر کر رہے ہیں)

ا۔ غضب خدا کا دسمبر کے شروع میں یہ سردی! ہاتھ پاؤں کیا ہوش و حواس تک جم کر رہ گئے۔

ب۔ (اخبار پر نظر ڈال کر) جی ہاں، کل کے موسم کی رپورٹ میں لکھا ہے۔ دلی میں درجۂ حرارت گر کر ۴۰ تک پہنچ گیا۔

ا۔ درجۂ حرارت؟ بہت معقول! ارے درجۂ برودت، درجۂ مصیبت درجۂ ہلاکت نہیں کہتے۔ لوگ سردی سے اکڑ کر رہ گئے اور آپ درجۂ حرارت لئے پھرتے ہیں۔

ب۔ تو صاحب میں اس کے لئے کیا کروں علمی اصطلاح یہی ہے۔

ا۔ بجا ارشاد ہوا، ہم بھی جانتے ہیں کہ علمی اصطلاح یہی ہے۔ مگر علم کے ساتھ کچھ اخلاق کا بھی تو خیال رہنا چاہئے۔

ب۔ آپ تو کچھ عجیب آدمی معلوم ہوتے ہیں، میں نے کون سی بد اخلاقی کی۔

ا۔ ہائے یہی تو آپ نہیں سمجھتے۔ جب لوگ جاڑوں مر رہے ہوں تو درجۂ حرارت کا نام لینا بد اخلاقی کیا بے دردی ہے خواجہ میر درد فرماتے ہیں۔ ع

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

ب۔ اس طرح سے تو زبان کھولنا مشکل ہو جائے گا۔ مثلاً اس میں یہ پیش گوئی ہے کہ اگلے تین چار روز میں رات کو سردی اور زیادہ بڑھ جائے گی۔ اس کا ذکر کرنا تو آپ کے نزدیک اور بھی بے دردی ہو گی۔

ا۔ آہ ظالم یہ کیا کہہ دیا۔ ع

اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

ارے بے دردی کیسی یہ تو قساوت ہے قساوت۔ کس بے پروائی سے فرماتے ہیں کہ اور بڑھ جائے گی سردی۔ اور اس اخبار پہ خدا کی مار، اسے کوئی اور خبر چھاپنے کو نہیں ملتی تھی۔

ب۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی عقل پہ ہنسوں یا روؤں۔

ا۔ ہنسئے ہنسئے، روئیں آپ کے دشمن، بس ہنسنے ہی کی کسر رہ گئی ہے۔

ب۔ ارے بندۂ خدا کیا سردی میرے یا کسی کے کہنے سے پڑتی ہے۔ کیا فطرت کسی کے الفاظ کی تابع ہے۔

ا۔ بے شک ہے۔ ورنہ شاعر وہ فال بد، حال بد، والی بات کیوں کہتا۔ مگر یہاں اس کا ذکر نہیں۔ فطرت کے تو خمیر میں بے مروتی ہے، انسان کیوں بے دید بن جائے۔

ب۔ تو آپ چاہتے کیا ہیں۔ علمی تحقیقات بند کر دی جائے۔ موسمیات کا محکمہ بند کر دیا جائے۔ سردی گرمی کا ذکر تک نہ آئے۔

ا۔ یہ کس کمبخت نے کہا ہے۔ آپ علمی تحقیقات، موسمیات جس قسم کی آنت اور بات چاہیں شوق سے کریں۔ مگر غریب انسان کے جذبات وحسیات کا تو خیال رکھئے۔ اگر اس قسم کی منحوس خبر سنانا ایسا ہی ضروری ہو تو دو چار ہمدردی کے کلمے تو کہہ دیا کیجئے۔ مثلاً "افسوس یہ کہتے ہوئے کلیجہ کٹتا ہے کہ یہ سردی جو تلوار کی دھار کی طرح تیز ہے اور تیز ہونے والی ہے"۔ آہ کس دل سے کہا جائے کہ اس قہر کی سردی

کے بعد قیامت کی سردی پڑنے والی ہے۔"
ب۔ بہت اچھا اب خیال رکھوں گا۔ مگر اس وقت کس منہ سے کہوں کہ میرا اسٹیشن آ گیا۔ مجھے اترنا ہے۔

۳

۲۴ر جنوری ۱۹۴۹ء

"کیا بتاؤں میں تو اس نالائق کی حرکتوں کو دیکھتے دیکھتے زندگی سے عاجز آ گیا ہوں۔ جی چاہتا ہے کسی روز کچھ کھا کر سو رہوں۔"
"تو کیا اور آپ کچھ کھائے بغیر سو جاتے ہیں؟ یہ تو بڑی بُری بات ہے۔ آخر آپ کو خالی پیٹ نیند کیسے آتی ہے؟"
"آپ کو تو ہمیشہ مذاق سوجھتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی دل لگی کا موقع ہے"
"ہرگز نہیں، یہ تو سر پیٹنے کا موقع ہے۔ مگر کیسے پیٹوں۔ پاسِ ادب مانع ہے۔ سچ کہتا ہوں مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے۔ لے دے کے ایک بیٹا اور وہ بھی ایسا سپوت نکلا۔"
"اس کمبخت کو آپ سپوت کہتے ہیں؟"
"جو بیٹا باپ کے قدم بہ قدم ہو اسے سپوت نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ سچ بتایئے وہ کون سی ایسی حرکت کرتا ہے جو آپ نہیں کرتے؟"

"آپ ہی جیسے لوگ تو نوجوانوں کو بگاڑتے ہیں۔ بھلا بیٹے کو باپ کی اچھی باتیں سیکھنی چاہیئں یا بُری باتیں؟"

"چاہنے کا ذکر نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ وہ کم و بیش دونوں ہی طرح کی باتیں سیکھتا ہے۔"

"ہوتا ہے سے کیا کام چلے گا۔ ہمیں تو اپنی اولاد کو "چاہیئے" کی تعلیم دینا ہے۔"

"ضرور دیجئے۔ بڑا ثواب ہوگا۔ مگر فائدہ کچھ نہیں ہوگا۔ آخر آپ نے اتنے دن کوشش کر کے دیکھ لیا۔"

"تو آپ ہی بتایئے اب کیا کروں؟"

"یہ کیجئے کہ "چاہیئے" کی عمارت بنانے سے پہلے "ہوتا ہے" کی بنیاد کو درست کر لیجئے۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا، اس کو اس کے حال پر چھوڑ دوں۔"

"جی نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو اپنے حال پر نہ چھوڑیئے۔"

"یہ آپ کیا پہیلیاں بجھواتے ہیں؟ میری سمجھ میں آپ کی بات بالکل نہیں آئی۔"

"سمجھ میں تو ضرور آگئی ہوگی، یہ کہیئے کہ دل میں نہیں بیٹھی۔ جب بات کو کچھ کھا کر سو رہنے کو جی چاہے۔ اُس وقت سوچئے گا۔"

۴

۱۶ر فروری ۱۹۴۹ء

جنتا ایکسپریس کے جس ڈبے میں خاکسار نے بند کھڑکی کے کھلے منہ میں سر ڈال کر غوطہ لگایا، وہاں جمہوریت براج رہی تھی یعنی جگہ کی تقسیم "سب کو برابر" یا ہر ایک کو "بہ قدرِ ضرورت" کے اصول پر نہ تھی بلکہ جرأت رندانہ کے حساب سے۔ کچھ لوگ اس طرح پھیل پڑے تھے کہ دوسروں کو سکڑنا ہی پڑتا تھا، بہ قول شاعر

سیٹ اُس کی بنچ اُس کی بلکہ ڈبہ اس کا ہے
جس کی ٹانگیں تیری پسلی پہ خراماں ہوگئیں

کہیں آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ پر اسباب ڈھیر تھا اور کہیں اسباب رکھنے کی جگہ پر آدمی ڈھیر تھے۔ جب میں غوطہ لگا کر ابھرا تو بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد دو موٹے سیٹھوں کے بیچ میں ایک پاؤں گاڑی کے فرش پر اور ایک اسباب کی گٹھری پر رکھ کر کھڑے ہونے کی جگہ ملی۔ ایک تو یوں ہی دم گھٹ رہا تھا اور کچھ مزکلا جاتا تھا اور اوپر سے گھڑکیوں اور جھڑکیوں کی بوچھار ہو رہی تھی۔ میری وہ کیفیت تھی جیسے جنوبی افریقہ میں کوئی کالا گوروں کی بستی میں جا پھنسا ہو، جس سے آنکھیں چار ہوتی تھیں وہ ڈاکٹر ملان کی طرح خون کا پیاسا نظر آتا تھا۔

یوں بدل دیں خوف نے سارے جہاں کی صورتیں آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہوں جس طرف صیاد تھا

اور میرا خوف بے بنیاد نہ تھا اس لئے کہ ایک صاحب کے خلاف، جنھوں نے میری طرح ڈبے کے دوسرے سرے پر قانون داخلہ کی خلاف ورزی کی تھی۔ اور لڑ جھگڑ کر اپنی مداخلت بیجا کو بجا ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ڈائریکٹ ایکشن شروع ہو گیا تھا۔ میں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ دم سادھے چپ چاپ کھڑا رہوں، پھر بھی دل میں ڈر رہا تھا کہ دیکھئے گاڑی چلنے کے بعد میرے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے مگر گاڑی کے حرکت میں آتے ہی ڈبے میں سکون ہو گیا۔ ادھر ان زبان دراز بزرگ کو جان کی امان مل گئی اور ادھر مجھ بے زبان پر جو گرم فقروں اور تیکھی نظروں کی بوچھار ہو رہی تھی وہ رک گئی۔ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں ڈاکٹر ملان کے قہر کی جگہ ڈاکٹر اسمٹس کا تحمل چھلکنے لگا۔ میرے محدود حقوق شہریت تسلیم کر لئے گئے اور ایک ٹانگ پر کھڑے رہنے کی اجازت مل گئی۔ دونوں طرف سے ٹھوس اور دبیز جسموں کا جو دباؤ پڑ رہا تھا وہ بھی کم ہو گیا اور پیٹ میں سانس سمانے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے دلیس بھائیوں میں پریم کے رس کی کمی نہیں ہے۔ مگر کبھی کبھی یہ رس تھوڑی دیر کیلئے تاؤ کھا کر سرکہ بنجاتا ہے۔ اگر ان میں اتنی سہار ہو کہ وہ دوسروں کا تاؤ ٹھنڈا ہونے تک خود جوش میں آ کر اُبل نہ پڑیں تو ہماری زندگی کی چاشنی اتنی تیز نہ ہونے پائے۔

۵

یکم مارچ ۱۹۴۹ء

رات کھانے پر شب دیگ اتنے مزے کی تھی کہ صبح اُٹھا تو طبیعت کو سخت بدمزہ پایا۔ ناشتہ نہیں کرنا چاہیئے تھا، مگر کیا کرتا؟ ایک دوست نے نہاری بھیجدی تھی

نہار توبہ شکن می رسد چہ چارہ کنم

ناشتے کے عمل نے داخل، خارج کی کارروائی کی صورت اختیار کرلی۔ کلّی کرکے پلنگ پر لیٹا تھا کہ معلوم ہوا کہ ایک صاحب ملنے کو آئے ہیں۔ باہر آیا تو دیکھا ایک بزرگ سوٹ سے آراستہ، بوٹ سے مسلح ہاتھ میں چمڑے کا بیگ لئے کھڑے ہیں۔ میں سمجھا کوئی لاگو ڈاکٹر ہے جو دور سے شکار کی بو پاکر آن پہنچا ہے۔ پہلا سوال جو ان حضرت نے کیا اس سے یقین ہوگیا کہ یہ ضرور عدمستان کے ہائی کمشنر کے ہاں پرمٹ آفیسر ہیں۔

"خیر تو ہے کیسا مزاج ہے؟"

"یہاں سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت درگاہِ الٰہی سے مطلوب"

"آپ کا سانس پھول رہا ہے، چہرے پر غیر طبعی سرخی ہے معلوم ہوتا ہے خون کا دباؤ بڑھا ہوا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب میں تو بچپن سے دباؤ سہنے کا عادی ہوں۔ شادی کے بعد سے زیادہ لوچ پیدا ہو گیا ہے۔"

"جی وہ علّت اور ہے یہ اور ہے اس میں تو شریان پتلے پڑ جاتے ہیں، اور ان پر دورانِ خون سے بہت زیادہ دباؤ ——"

"اف ڈاکٹر صاحب یہ شریاں تو بڑا خبیث مرض معلوم ہوتا ہے۔ سچ بتایئے کہیں مہلک تو نہیں؟"

"اب آپ سچ پوچھتے ہیں تو کہنا ہی پڑے گا، خون کا دباؤ مہلک بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا شدید حملہ فالج کی شکل میں ہوتا ہے اور فالج خدا کی پناہ! جس عضو پر گرا اسے شل کر دیا، عضو معطل کر دیا۔ اور کہیں خون اندر اندر زیادہ بہہ گیا تو پھر الامان! الحفیظ!"

"خدا کے لئے ڈاکٹر صاحب زرا آلہ لگا کر دیکھئے گا میرے کان پر یقیناً فالج گر گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اندر ہی اندر خون کی دھار بہہ رہی ہے۔"

"میں آپ کے سچے خیر خواہ کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ آپ فوراً انشورنس پالیسی خرید لیجئے۔ ابھی مرض کی ابتدا ہے، بیمہ ہو سکتا ہے"

"زرا ٹھہرئے گا آپ ڈاکٹر ——"

"جی نہیں میں انشورنس کا ایجنٹ ہوں۔"

"مجھے ایسا معلوم ہوا کہ خون کان سے اندر ہی اندر اوپر چڑھ رہا ہے اور کوئی دم میں سر پہ سوار ہو جائے گا۔"

منا

۶

فرخندہ دار الاسلام ۸ / اپریل ۱۹۴۹ء Hanif Abdullah

"واللہ میر صاحب، آپ تو بالکل بوڑھے ہوگئے"

"جی یہ تو خاندانی مرض ہے۔ والدِ مرحوم بھی آخر عمر میں بوڑھے ہو گئے تھے"

"مگر ماشاءاللہ آپ کا دل ابھی جوان ہے"

"کیا کہنا بڑا اکسرتی جوان ہے۔ جب دیکھئے ڈنڑ پیلتا رہتا ہے"

"سچ بتائیے میر صاحب کبھی آپ کو عشق بھی ہوا ہے"

"ابھی تک تو دماغ ٹھیک رہا ہے۔ آگے کی خبر نہیں"

"یہ کیا بات ہوئی میر صاحب، کیا عشق آپ کے خیال میں دماغ کی خرابی ہے"

"ایک میرا کیا، ہر بھلے آدمی کا یہی خیال ہے، مرزا غالب فرما گئے ہیں۔ ع

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا"

"مگر یہ بھی تو مرزا غالب ہی نے کہا ہے۔ ع

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا"

"اچھا تو آپ مرنے کے لفظ سے دھوکا کھا گئے۔ حضرت یہ مزا کچھ اور ہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ بے بھاؤ کی پڑیں کہ بس مزہ ہی

آگیا۔ زرا دوسرے مصرعہ پر بھی تو غور کیجئے۔ ع

درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

یعنی سر کا درد تو جاتا رہا لیکن ٹاٹ جو گنجی ہو گئی اس کا کیا علاج۔"

"واہ میر صاحب آپ نے تو غالب کے کلام کی تاویل میں طباطبائی کی شرح کو بھی مات کر دیا۔ آخر آپ عشق کا مفہوم کیا سمجھتے ہیں جو اس سے اتنے خفا ہیں۔ محبّت بُری چیز ہے؟"

"لو اور سنو۔ کہاں محبّت کہاں عشق! ارے بھئی محبّت تو ایک بیل ہے۔ سینچنے سے دھیرے دھیرے بڑھتی ہے، چڑھانے سے پروان چڑھتی ہے اور اپنے وقت پر پھولتی پھلتی ہے اور عشق ایک آگ ہے جس کے بارے میں آتش اور غالب نے مل کر یہ شعر کہا ہے ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

آپ ہیں کہ بیٹھے ہوئے سلگا رہے ہیں، پھونک رہے ہیں، دھونک رہے ہیں اور وہ ہے کہ کسی طرح نہیں لگتی اور جب جی چاہا آپ ہی آپ سلگ گئی، جل اٹھی، بھڑکنے لگی۔ اب بتایئے یہ خلل دماغ نہیں تو اور کیا ہے کہ آدمی ایسی آگ سے کھیلے۔ لگانے کی کوشش کی اور ناکام رہے تو مفت میں جی جلتا ہے اور کامیاب ہو گئے تو ڈاڑھی جل جانے کا اندیشہ ہے اور پھر آتش زنی کے الزام میں دھر لئے گئے تو بس کچھ نہ پوچھیے۔ ع

زیست کا مزا پایا اور درد لا دوا پایا

۶

یکم مئی ۱۹۴۹ء

علامہ اقبال کی گفتگو دلکشی میں ان کی شاعری سے کم نہ تھی۔ حکمت کے صوفیانہ رنگ پر ظرافت کا شوخ رنگ عجب بہار دیتا تھا۔

ایک بار علی گڑھ سے لاہور جاتے ہوئے دہلی کے اسٹیشن پر چند گھنٹے قیام فرمایا۔ ان دنوں شاید علامہ اپنے علم و فضل کو نظر بد سے بچانے کے لئے اپنے ساتھ بجر بٹو کے طور پر ایک فہامہ کو رکھتے تھے جن کے فہم اور فراست کو نظر لگنے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ اول درجہ کے ویٹنگ روم میں علامہ ایک آرام کرسی پر رونق افروز تھے۔ آس پاس نیاز مندوں کا حلقہ تھا جو موصوف کی زیارت کے لئے شہر سے آگئے تھے۔ سلسلۂ گفتگو میں فرمایا:۔

"جب دہلی سے گذرتا ہوں تو حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم بہت یاد آتے ہیں۔ ایک زمانے میں انھوں نے میرے لئے حب کبد کا استعمال تجویز کیا تھا۔ اب مجھے ضرورت نہیں رہی۔ مگر مرحوم کی یادگار کے طور پر کھا لیا کرتا ہوں۔" اس کے بعد فہامہ کو حکم دیا کہ اسٹیشن کے امانت خانے میں جا کر سوٹ کیس میں سے حب کبد کی ڈبیہ لے آئیں فہامہ نے ایک لمبی چوڑی تقریر میں منطقی دلیلوں سے ثابت کرنا چاہا کہ یہ ہفت خواں اتنے تھوڑے وقت میں سر نہیں ہو سکتا۔ مگر علامہ کے

تیور دیکھ کر جاتے ہی بن پڑی۔ آدمی بڑے مستعد ہیں۔ پانچ منٹ کے اندر ڈبیا لیئے ہوئے آ گئے۔ علامہ نے فرمایا "آپ میں یہی تو بڑی خوبی ہے کہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں" فہامہ فقرے کو تو کیا سمجھتے مگر بگڑ کر کہنے لگے "آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے جھوٹ موٹ بہانہ کر دیا تھا"
علامہ نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا "حاشا وکلا میں آپ کی نسبت کبھی ایسا گمان نہیں کر سکتا اس لیئے کہ جھوٹ بولنے اور بہانہ کرنے کے لیئے کچھ تھوڑی سی عقل چاہیئے"

اسی صحبت میں پنجاب کے ایک بزرگ کا ذکر آ گیا جن کا کسی زمانے میں سیاست اور صحافت میں طوطی بولتا تھا مگر اب طوطی کے پر جھڑ گئے تھے اور آواز بیٹھ گئی تھی۔ علامہ نے فرمایا "مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ساری کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ ہر آدمی کو اسی نے بنایا ہے۔ مگر بھئی ہمیں تو یقین نہیں آیا کہ .... کو خدا کا بنایا ہوا ہے۔ اور اگر کوئی کہے کہ اسے شیطان نے بنایا ہے تب بھی ہم نہیں مانیں گے۔ اس لیئے کہ شیطان کی شیطنت کی بھی آخر کوئی حد ہے"

ایک صاحب حسن رسیدہ ایم رایل اے جنھوں نے مولویوں کی سی وضع قطع اختیار کر رکھی تھی۔ اسی سادہ لوحی کی بدولت اکثر علامہ کی شوخیٔ طبع کا نشانہ بنا کرتے تھے۔ ایک دن یہ حضرت کسی نوجوان انگریز خاتون کو ٹیلیفون کرتے ہوئے رشتہ خطمی ہوئے جا رہے تھے

باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ آنکھیں کچھ مسکرا رہی تھیں، کچھ مسکرا رہی تھیں۔ خالی ہاتھ کی انگلیاں سفید ڈاڑھی سے کھیل رہی تھیں۔ کہیں علامہ نے دیکھ لیا۔ فرمایا "مولانا افسوس آپ کی یہ ساری ادائیں بیکار جا رہی ہیں۔ آواز کو تو موج ہوا وہاں تک پہنچا دے گی۔ مگر یہ ناز و انداز یہیں رہ جائیں گے۔"

چودھری شہاب الدین کے بارے میں علامہ اقبال کے بہت سے لطیفے مشہور ہیں۔ مثال کے طور پر ایک سُن لیجئے:۔

"چودھری صاحب کا رنگ پکّا آبنوسی تھا چنانچہ جب وہ کالا سوٹ پہنتے تھے تو بقول علامہ اس پر جامۂ اصلی کا دھوکا ہوتا تھا۔ ایک دن علامہ نے چودھری صاحب سے فرمایا "آپ کا رنگ سیاہ ہے تو کیا ہوا، یہ کتنی بڑی بات ہے کہ ظاہر و باطن ایک سا ہے۔"

۸

(۲۴ رمئی ۱۹۴۹ء)

"کہو تمہارا درآمد برآمد کا کاروبار اچھی طرح چل رہا ہے؟"

"اسے چھوڑے ہوئے تو مدت ہوئی حضور آزادی کے بعد سے خوشامد درآمد کا بیوپار شروع کر دیا ہے۔"

"تم بھی نکمّے ہی نکلے، ایسا اچھا کام چھوڑ بیٹھے"

"یہ اس سے بھی چوکھا کام ہے سرکار! دیس کا مال دیس ہی میں کھپ جاتا ہے اور مانگ اتنی کہ پورا کرنا مشکل، پھر یہ دیکھئے کہ سبیتا کتنا ہے جتنا مال چاہو بناؤ اور جہاں چاہو بیچو۔ نہ پرمٹ کا جھگڑا نہ چنگی کا بکھیڑا نہ آبکاری کا ڈر۔"

"آبکاری کیا معنی! کیا خوشامد کچھ شراب کی قسم سے ہے؟"

"بے شک حضور! شراب اور وہ بھی کچے گھڑے کی، جو چلّو میں اُلّو بنادے۔"

"مگر اس شراب کی قدر تو انگریز کے زمانے میں زیادہ تھی، اب تو ان لوگوں کا دور ہے جو زاہدِ خشک کہلاتے ہیں۔"

"انھیں خشکوں کو تو تراوٹ چاہیئے سرکار! انگریز بھلا کیا خاک پیتا، وہ تو اپنے ٹھکرائی کی ترنگ میں بن پیئے مست رہتا تھا۔ بہت ہوا تو ذرا سی ہلکی ولائتی قسم کی پی لی، وہ بھی پہروں میں چسکی لے لے کر۔ اب تو ہمارے نیتا اور ادھیکاری، قائد اور حاکم شدہ دیسی ٹھرّے کا مٹکے کا مٹکا چڑھا جائیں اور پھر پیاسے کے پیاسے۔"

"مگر سب کو تو نہ کہو۔ آخر ہم بھی تو ہیں کہ خوشامد کے نام سے بھڑکتے ہیں۔ کبھی ہم کو خوشامد سے رِجھا لو تو جانیں۔"

"بھلا حضور کا کیا ذکر ہے۔ جان کی امان ہو تو کہوں کہ بس

ایک رنگ ذرا سا تاؤ دکھا گیا ورنہ سرکار کو جدھر سے دیکھئے انگریز معلوم ہوتے ہیں۔ وہی آن گھڑ کا پنڈا، وہی تیکھے تیور، وہی روکھا چہرا، وہی کھری باتیں۔ حضور کو مٹھارنے کی ہمت تو وہ کرے جس نے ولایت میں مسکا لگانا سیکھا ہو۔ ہم جیسے کڑوا تیل چچوڑنے والے بھلا کیا کھا کے حضور کو پرچائیں گے۔"

"خیر۔ اور جو کچھ بھی ہو، مگر تم آدمی کو پہچانتے ضرور ہو۔"

"خدا جیتا رکھے، اسی کی تو روٹی کھاتے ہیں، حضور جیسے قدر دانوں کی بدولت اس مہنگائی میں بھی مزے سے گزرتی ہے استاد کہہ گیا ہے:-

"مفلس کسں نمی ماند"

۹

(۱۰؍ جون ۱۹۴۹ء)

"سچ کہو میاں صادق یہ تم اتنا جھوٹ کیوں بولتے ہو؟"

"بھئی واہ وا! کیا خوب کہا ہے۔ تعریف نہیں ہوسکتی۔ یہ رعایت لفظی، یہ صنعت تضاد، اور پھر یہ سادگی اور پرکاری۔ یہ بے تکلفی اور بے ساختہ پن۔"

"کیوں صاحبزادے باریش بابا ہم بازی۔ مجھے بھی بنانے لگے"

"توبہ کیجئے شیخ جی۔ یہ آپ نے کیا کہہ دیا۔ بنانے والا وہ معبود ہے۔ بندۂ ناچیز کی کیا بساط کہ کسی کو بنائے"

"ہو تم پورے بھانڈ۔ اب حقانی الاپنی شروع کر دی۔ آخر میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیتے ہو؟"

"اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو بزرگوں کو جواب دینا بے ادبی ہے۔ استاد کہہ گیا ہے۔ ع
جواب شیخ جی باشد خموشی

دوسرے آپ کا سوال وہ ہے جسے منطق کی اصطلاح میں ــــ"

"خدا کے لئے اب منطق نہ بگھارو، میرے حال پر رحم کرو۔"

"ارے یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ میرا شیخ منطق نہیں پڑھا ہے۔ خیر بگھارنے پر خیال آیا کہ آپ کے سوال کو پیاز نما کہہ سکتے ہیں اس لئے کہ اس میں پرت کے اندر پرت لپٹے ہوئے ہیں۔ "تم اتنا جھوٹ کیوں بولتے ہو" اس سوال کے پیٹ میں دو اور سوال چھپے ہوئے ہیں۔ "کیا تم جھوٹ بولتے ہو؟"۔ "کیا تم اتنا جھوٹ بولتے ہو؟" جب تک ان ضمنی سوالوں کا جواب نہ مل جائے اصل سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔"

"اچھا پہلے اس کا جواب دو "کیا تم جھوٹ بولتے ہو؟"

"شیخ جی مذاق برطرف۔ آخر آپ کو میری طرف سے یہ بدگمانی کیوں ہے کہ میں جھوٹ بولتا ہوں۔ میں تو اپنی دانست میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں کہتا۔"

"ارے خدا کے غضب سے ڈرو۔ تم نے یہ نہیں کہا کہ ہندوستان اور پاکستان میں اب ایک شخص بھی بے گھر نہیں رہا۔ پناہ گزیں دوبارہ بسائے جا چکے ہیں۔ اس سے بڑھ کر سفید جھوٹ اور کیا ہوگا؟ تم دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتے ہو۔"

"لاحول ولاقوۃ! آپ ایک ذرا سے ترکیب نحوی کے فرق سے دھوکا کھا گئے۔ کاش آپ نے تھوڑی سی عربی پڑھی ہوتی۔ ارے مرد خدا آخر ہم جملۂ خبریہ کو دعائیہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں یا نہیں جیسے زاد عمرہٗ۔ زیادہ کی عمر اس کی۔ یعنی اللہ کرے اس کی عمر زیادہ ہو اسی طرح کوئی بے گھر نہیں رہا۔ یعنی اللہ کرے کوئی بے گھر نہ رہے۔ کیا سمجھے؟"

۱۰

(۲۴ جون ۱۹۴۹ء)

"کہئے ماسٹر صاحب، راوی کیا لکھتا ہے؟ ہے کوئی مزے دار خبر؟"

"اب مزے دار خبریں کہاں! وہی چار طاقتوں کی جنگ زرگری، وہی چین کی جنگِ مغلوبہ، وہی یو۔این۔او کی دفع الوقتی۔ ہاں ہمارے محکمے کے متعلق ایک خبر ہے۔ یو۔پی کی حکومت نے امدادی مدرسوں ـــــ"

"ذرا ٹھہریئے گا۔ امدادی مدرسے وہی ہوتے ہیں نا جن کا آدھا خرچ حکومت دیتی ہے اور آدھا کوئی نہیں دیتا؟"

"کیا مطلب؟ کوئی نہیں دیتا تو پورا کیونکر ہوتا ہے؟"

"میں نے سُنا ہے کہ کاغذ پر پُورا ہو جاتا ہے۔ مگر اصل میں آدھا ہی رہتا ہے۔ ہاں تو آپ کیا فرما رہے تھے؟ امدادی مدرسوں ـــــ"

"ـــــ کے انتظام کو بہتر بنانے کے لئے جو کمیٹی مقرر کی تھی اس کی ایک سفارش یہ بھی ہے کہ شرارت کے بدلے جسمانی سزا دی جائے۔"

"کس کو؟"

"کس کو کیا معنی؟ ظاہر ہے کہ بید صرف لڑکوں کو لگائے جاتے ہیں کسی اور کا سوال ہی نہیں۔"

"سوال کیوں نہیں ماسٹر صاحب۔ سوال ہے اور ایسا ہے جس کا جواب ہی نہیں۔ اگر یہ بید سادہ کا نسخہ اتنا مفید ہے تو صرف لڑکوں ہی کو کیوں استعمال کرایا جائے۔ استاد شرارت کریں تو ان کو بھی پانی میں بھگو کر اچھی طرح چکھایئے۔"

"استاد اور شرارت! یہ تم کیسی اٹکل پچّو باتیں کر رہے ہو؟ شرارت وہ کہلاتی ہے جو لڑکے کرتے ہیں؟"

"اور جو اُستاد کرتے ہیں، وہ کیا کہلاتی ہے؟"

"عجب لغو سوال ہے؟ شاید تمہارا اشارہ استادوں کی لغزش کی طرف ہے"

"خیر آپ لغزش کہہ لیجئے، اور زیادہ پاسِ ادب ملحوظ ہو تو حرکت کہہ لیجئے۔ بہرحال میرا سوال اپنی جگہ پر ہے کہ اگر لڑکے اور اُستاد ایک ہی فعل کے مرتکب ہوں تو کیا وجہ ہے کہ بید یا قمچی یا مولا بخش کا فیض صرف لڑکوں ہی تک محدود رہے؟ آخر اُستاد کو اس سے کیوں محروم رکھا جائے"

معلوم نہیں تمہارے دماغ میں خلل ہے یا محض مسخرے پن میں ایسی بے تکی باتیں کرتے ہو۔ غضب خدا کا استاد کو زدوکوب کیا جائے تو لڑکوں کی نظر میں اس کی کیا عزت رہے گی، اور اس کی خود داری کو کتنی ٹھیس لگے گی!"

"اور ماسٹر صاحب اگر لڑکے کی ٹھکائی کی جائے تو اپنی نظر میں اس کی کیا عزت رہے گی اور اس کی خود داری کو جو کہیں زیادہ نازک اور زود حس ہوتی ہے کتنی ٹھیس لگے گی؟"

"تم ہو تو ہو لو، مگر بات اس وقت ٹھکانے کی کہی۔ میں خود سوچ رہا تھا کہ سمپورنانند جی کو ایک عرضداشت بھیجوں"

"اجی عرضداشت کیا، بس اتنا لکھ دیجئے"

گر کمیٹی کی مان لی تجویز
کارِ طفلاں تمام خواہد شد

۱۱

(۲۴ ستمبر ۱۹۴۹ء)

ریل کے دوسرے درجے میں دو سجن آمنے سامنے سیٹوں پہ بیٹھے ہیں قد و قامت کے لحاظ سے ایک کو قلمی اور دوسرے کو تخمی کہہ سکتے ہیں۔ کھٹے میٹھے کا اندازہ آپ کو ان کی گفتگو سے ہوگا۔

تخمی۔ (اخبار پڑھتے پڑھتے) سیٹھ جی اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں، آپ کھاتے کیا ہیں؟

قلمی۔ (کھٹی ڈکار لے کر) جی نفع کھاتا ہوں، بیاج کھاتا ہوں، چور بازار کی کمائی کھاتا ہوں۔ پھر کسی کے باپ کا اجارہ ہے؟

تخمی۔ ارے رے رے! سیٹھ جی آپ خفا ہو گئے۔ میں طعن سے نہیں پوچھ رہا تھا۔ بھلا آپ کو کیا طعنہ دونگا میں خود لخت جگر کھاتا ہوں اور خون دل پیتا ہوں۔ دونوں حرام چیزیں! میں نے ایک وجہ سے یہ سوال کیا اس اخبار میں ایک بڑے مزے کا خط چھپا ہے کسی پنجابی بھائی نے لکھا تھا کہ حکومت ہند کی ملازمتوں پہ تو اب مدراس کے مینن اور کشمیر کے کول اور کپور قبضہ کئے بیٹھے ہیں۔ اس پہ ایک طالب علم جنھوں نے اپنے لئے سمجھ لیا (بروزن پٹھو لیا) کا لقب پسند کیا ہے لکھتے ہیں کہ بھائی جی شکایت کی کوئی بات نہیں۔ یہ سارا کھیل غذا کا ہے۔ آدمی کا جسم کیا ہے ایک کیمیا کی بھٹی ———

قلمی۔ (سنبھل کر) کیا کہا کیمیا؟

تمنی - سیٹھ جی وہ کیمیا نہیں جس میں سدا ایک آنچ کی کسر رہ جاتی تھی آجکل کیمیا کیمسٹری کو کہتے ہیں جس میں بتولے کا تھی۔ رائی کا پربت، بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔ ہاں تو ان طالب علم کے خط کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے جسم کی بھٹی میں چاول سے اسٹارچ بنتا ہے جس سے بدن میں چستی ——

قلمی - انگریز ہندوستان سے چلا گیا مگر انگریزی ہمارے بھگتنے کو چھوڑ گیا یہ اسٹارچ کیا بلا ہے؟

تمنی - سچ کہا آپ نے انگریز کا سکّہ ہندوستان سے اٹھ گیا اور امریکہ میں گر گیا مگر انگریزی کا سکّہ دونوں جگہ اسی ٹھاٹھ سے چلتا ہے۔ اسٹارچ وہ ہے جس سے کلف بنتا ہے۔ بڑی اچھی چیز ہے جس طرح کلف سے کپڑا اسی طرح اسٹارچ سے آپ کا بدن کرارا ہوتا ہے، مگر زیادہ نہ ہو نہیں تو اینٹھ کر رہ جائے گا۔ انگریزی معاف ایک اور جز پروٹین ہے جو گیہوں میں بھی پایا جاتا ہے لیکن گوشت وغیرہ میں اچھی قسم کا ہوتا ہے جس سے دماغ پرورش پاتا ہے۔ بقول بچے لیڈے کے مدراس کے مین اتنے تیز اسی وجہ سے ہوتے ہیں کہ وہ چاول، ترکاری، دہی کے علاوہ جانوروں کی چربی استعمال کرتے ہیں۔ کول اور کھسر ان سے بھی چوکھے ہیں۔ ان کی غذا ہیں چاول، روٹی، گوشت، ترکاری اور پھل غرض وہ سب چیزیں ہیں جن سے جسم اور دماغ کو قوت پہنچتی ہے پھر بتایئے کہ دال روٹی کھانے والے کیا کھا کے ذہانت میں ان

مدراسیوں اور کشمیریوں کا مقابلہ کریں گے۔

قلمی۔ ابھی بس رہنے بھی دو، ہم نے بھی بہت سُنا ہے کہ یہ کھاؤ اور وہ کھاؤ آدمی کھانے کو تو سب کچھ، مگر ہضم بھی ہو، یہاں معمولی پوری کچوری ترکاری، مٹھائی تو پچتی نہیں۔ یہ سب الم غلم کھا کر کیا حال ہوگا۔

تخمی۔ سیٹھ جی آپ خفا نہ ہوں تو عرض کروں کہ تلی ہوئی چیزیں اور کھوئے کی مٹھائی ہضم کرنے کے لیے ایڑی سے چوٹی تک پسینہ بہانے کی ضرورت ہے جو دن بھر آلتھی پالتھی مارے بیٹھا رہے اُسے تو پرائے مال کے سوا کچھ بھی نہیں ہضم ہونے کا۔

قلمی۔ پھر وہی پاجی پن کی بات، بدتمیز کہیں کا سوشلسٹ ——

تخمی۔ بس بس سیٹھ جی، سوشلسٹ ہی تک رہنے دیجئے۔ آگے نہ بڑھیئے گا نہیں ایسا ثقیل لقمہ آجائے گا جو کسی چورن سے نہیں پچتا۔

۱۲

(۸ راکتوبر ۱۹۴۹ء)

اتوار کا دن، چھ بجے شام کا وقت، نہر کے کنارے سیلانیوں کا جمگھٹا ہے۔ ہر طرف چہل پہل نظر آرہی ہے۔ ایک طرف ایک بنچ پر چار حضرات جنھیں آپ سفید پوش نہ کہیں تو بُرا مان جائیں گے بیٹھے گپ شپ

کر رہے ہیں۔ اُن میں سے دو کا لہجہ خاصا چٹ پٹا ہے، بلکہ کبھی کبھی مرچ اور کھٹائی اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ گپ شپ پر اگل خپ کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔ تیسرے اور چوتھے صاحب اس چٹنی میں تھوڑی سی مٹھاس ملا کر زبان کا مزہ کچھ اور [illegible]

ا۔ کیا کہنا ہے اس آزادی کا۔ نہ رکھی جائے نہ اُٹھائی جائے۔ چور بازاری اور مہنگائی ہے کہ روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ گیہوں پہلے ہی شکر کے بھاؤ ہو گیا تھا۔ اب شکر گھی کے بھاؤ بکنے لگی۔ بس ایک آزادی سستی ہے۔

جگ جگ جیو۔ آزادی گھول کر پیو۔

ب۔ تم جیسے چٹوروں کو آزادی ناحق ملی۔ اس کا ہمیں بڑی افسوس ہے۔ تمہیں تو انگریز کی جوتیاں چاٹنے میں قند مکرر کا مزہ آتا تھا۔ غضب خدا کا! آزادی کا مقابلہ کھانڈ سے کرنے چلے ہیں۔ ارے ناشکرے کہیں آزادی شکر سے تولی جاتی ہے۔

(ج سے مخاطب ہو کر) کیوں بھئی مصری لال سچ بتاؤ تمہیں آزادی زیادہ عزیز ہے یا شکر؟

ج۔ ارے بھیا۔ ہماری بھلی چلائی۔ ہمارے تو دونوں ہی میٹھے۔ شکر سے کوٹھیاں بھریں۔ آزادی سے پیٹ بھرا۔ اور اس میں جھگڑا کاہے کا؟ شکر ملے شکر بیچو۔ آزادی ملے آزادی بیچو۔

ا۔ ہم سے پوچھو نا، مصری لال سے کیا پوچھتے ہو۔ پیٹ بھروں کی آزادی

کا پیمانہ تجوری کی رد کرو سہی، مگر غریبوں کی آزادی پیٹ تک ہی اگر ہٹا شکر آٹے سے، آٹا، نون تیل، لکڑی سے تولی اور ناپی جاتی ہے، جس آزادی سے بھوکوں کا پیٹ نہ بھرے وہ ہمارے کس کام کی؟ تم اسے نیبو نچوڑ کر چاٹا کرو۔ اب رہی انگریز کی غلامی تو ہم تو بے شک غلام تھے ہی تم کون سے آزادی کی دُم بن گئے؟ یہی نا کہ پہلے شکاری نے پنجرے میں بند کر رکھا تھا، اب پر نیچ کر کے چھوڑ دیا ہے۔

ب۔ اجی کیوں بے پر کی اڑاتے ہو؟ ابھی ہم نے پر پرزے نکالے ہی کہاں ہیں جو کوئی ہمیں پر نیچ کرے گا۔ مگر ہماری آزادی میں کیا کسر رہ گئی؟ آئین اپنا، حکومت اپنی، جھنڈا اپنا، سکہ اپنا اور آزاد قوموں میں کون سا سُرخاب کا پر لگا ہوتا ہے؟

ج۔ بس رہنے بھی دو۔ اور تو اور سکے کو بھی اپنا کہنے لگے۔ شرم تو نہ آتی ہوگی؟ جو سکہ اسٹرلنگ کی دُم سے بندھا ہو اور اس کے ساتھ کھچا کھچا پھرے اُسے کوئی آزاد کہے گا؟ انگریز کو خیر اپنا مال امریکہ کے سر منڈھنا ہے اور ڈالر بٹورنے ہیں، مگر تم نے کیوں بیٹھے بٹھائے اپنے سکے کو بٹہ لگا دیا۔ یہ ڈالر کی غلامی نہیں تو اور کیا ہے؟

د۔ بھئی واہ! بات شکر پتی سے شروع ہوئی اور ڈالر پتی تک پہنچ گئی۔ اگر ہماری بات مانو تو اس ڈالر کے پھیر میں نہ پڑو، اس میں بڑے بڑے گھن چکر بن جاتے ہیں۔

ب۔ ارے میاں کیوں ڈر کے مارے مرے جاتے ہو، ہم سکے کے بیوپار میں اناڑی سہی، مگر کھرے بنئے ہیں۔ کچھ پائیں گے تو پا کر سیکھیں گے، کھوئیں گے تو کھو کر سیکھیں گے۔ آزادی اس کے سوا کچھ نہیں کہ آدمی

کو آزما کر دیکھنے کا، بڑھ کر پلٹنے کا، اگر کر سنبھلنے کا موقع ملے۔ ہم ڈالر کے غلام ہیں نہ اسٹرلنگ کے۔ اپنی غرض کے بندے ہیں۔

ج۔ اور اس سے کوئی غرض نہیں کہ اس سکہ بازی کی مشق میں کس پہ کیا گذر جائے گی۔

کون گھائل ہوا خبر ہی نہیں
آپ کی مشقِ ناز کیا جانے

۱۳

(۲۴ر نومبر ۱۹۴۹ء)

"خیر تو ہے میر صاحب، یہ آج سرِ اقدس پہ کیا افتاد پڑی۔ آخر اس کا سرپوش کیا ہوا؟"

"بس رہنے دو اپنا مسخراپن۔ ایک تو یوں ہی صبح سحر کرکے چرچرکا لگ رہا ہے اوپر سے تم زخموں پر نمک چھڑکنے کو پہنچ گئے۔ آج ان کم بخت بندروں نے ناک میں دم بند کر دیا۔ ایک بالائی چکھ گیا، دوسرا کنگھا اڑا لے گیا۔ تیسرا ٹوپی لے بھاگا!"

"ارے معاف کیجئے گا۔ میر صاحب مجھے خبر نہ تھی کہ آلِ ڈارون سے بھی آپ کا مذاق کا رشتہ ہے۔ مگر یہ ٹوپی اتارنے کی دل لگی اچھی نہیں،

ایک تو آبرو کا معاملہ ہے دوسرے آپ کا فرق مبارک اور بھی زیادہ غیر محفوظ ہو جائے گا۔"

"ہو جائے گا تو ہو جانے دو ہم بھگت لیں گے ع

بر سر اولادِ آدم ہر چہ آید بگذرد

مگر تم لوگ اپنی خیر مناؤ، سُنا ہے ہمارے اس سن یکت پرانت میں جو آریہ ورت ہوتے ہوتے رہ گیا، بندروں کی تعداد ۲۰ لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ لکھنؤ تو خیر ہمیشہ سے بہت بڑی بندرہ گاہ ہے، مگر اب کچھ لکھنؤ پر موقوف نہیں، جہاں جائیے میاں ملّو براج رہے ہیں۔ دیکھو میں کہے دیتا ہوں کہ اگر زمینداری کے ساتھ ساتھ اس بندر گردی کو ختم نہ کیا تو ہم سب کو جو اپنے کو انسان کہتے ہیں یہاں سے دُم دبا کے بھاگنا ہو گا۔"

"میر صاحب اس مقدمہ کا یک طرفہ فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے فریق کی بھی سننی پڑے گی۔ فرض کیجئے آپ تھوڑی دیر کے لئے بندر بن جائیں اور میں ——"

"کیا کہا، میں بندر بن جاؤں ؟"

"نہیں توبہ، الٹی بات کہہ گیا۔ بندر میں بنتا ہوں، آپ تھوڑی دیر کے لئے انسان بن جائیے۔"

"یہ تھوڑی دیر کے لئے کیا معنی ؟"

"خیر جتنی دیر کے لئے آپ کا جی چاہے۔ مطلب یہ کہ دونوں فریقوں کی نمائندگی ہو جائے۔ اچھا اب یہ فرمائیے کہ آپ لوگ جو ابھی

چند ہزار سال آسٹریلیشیا اور مغربی یا شمالی ایشیا سے یہاں آن مرے ہیں کس حق سے ہم کو جو اس دیس کے پراچین باسی ہیں ختم کرنا چاہتے ہیں؟"
"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ہم اشرف مخلوق ہیں۔ زمین کی بادشاہی ہمارا حق ہے۔ جانوروں میں سے جو ہمارے کام کے ہیں انھیں ہم رہنے دیں گے۔ جو بے کار یا مضر ہیں انھیں ٹھکانے لگا دیں گے۔"
"اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی سند نہیں، اپنے اشرف مخلوق ہونے کی کوئی عقلی دلیل پیش کیجیے۔ آپ کے میاں ڈارون نے ارتقا کا مسئلہ بندر تک تو ٹھیک پہنچایا۔ اس کے بعد بہک گئے، اور انسان کو جو بندر کا بگڑا ہوا چربہ ہے اشرف مخلوق سمجھ بیٹھے۔ انھیں یہ نہ سوجھا کہ ارتقا کا پہیہ بندر پر پہنچ کر رک گیا، اب الٹا چل رہا ہے۔"
"پہیہ الٹا چلے یا سیدھا تمہارا دماغ ضرور چل گیا ہے، نہ جانے کیا اوٹ پٹانگ بک رہے ہو۔ کہنے لگے انسان بندر کا بگڑا ہوا چربہ ہے بھلا بندر کیا کھا کے انسان کا مقابلہ کرے گا!"
"خیر چربے والی بات تو آپ کے پلے پڑی۔ مگر قصور معاف۔ اس راشن کے زمانے میں تو آپ کو یہ کہنا زیب نہیں دیتا کہ بندر کیا کھا کے ـــــ"
"اب تم اتنے بھی بندر نہیں ہو کہ محاورہ نہ سمجھو۔ مطلب یہ ہے کہ کہاں انسان کہاں بندر۔ ذرا ہیئت کو ملاحظہ کیجیے۔ چیاں سی آنکھیں لیے، دم لٹکائے، لمبی سی تھوتھنی نکالے، چاروں ہاتھ پاؤں پر کھڑے ہیں، اور اداہیں دیکھیے اِدھر کودے اُدھر پھاندے، اس کا منہ چڑا یا

اس کو بھبکی دی، یہ کھا گیے، وہ لے بھاگے، بھلا کوئی بات بھی انسانیت کی ہے، چلے ہیں انسان کا مقابلہ کرنے۔"

"مگر زرا اپنی برزخ بھی تو آئینے میں دیکھیے، کوڑیوں سی آنکھیں، گھونگا سا مُنہ، دھونکنی سی ناک، دُم کا پتہ نہیں۔ دو پاؤں پر پُھدک رہے ہیں۔ پھر آپ کی حرکتیں، اِدھر لد کے آئے، اُدھر اُڑ کے پہنچے، اس سے جھک جھک، اُس سے بک بک، اِسے مارا، اُسے کاٹا، اِسے پٹی پڑھائی، اُسے جھانسا دیا، بھلا کوئی بات بھی میمونیت کی ہے۔ چلے ہیں بندر کا مقابلہ کرنے۔"

"بھئی واللہ تم نے اپنا پارٹ نبھا دیا، نقالی تو بندر کے حصے میں آئی ہے۔ انسان کی ایک ایک چیز کی نقل اُتارتا ہے۔ اگر ہو سکتا تو لفظوں کو بھی اسی طرح دُہراتا، تم ضرور پہلے بندر رہ چکے ہو اور تمہیں اس جنم کی حرکتیں اب تک یاد رہیں۔"

"میر صاحب ایک بات آپ کو بتاتا ہوں، کبھی پینک میں سوچیے گا یہ بندر جو انسان کی حرکتوں کی نقل کرتا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ اس کی اپنی پُرانی بھولی ہوئی حرکتیں ہیں، انسان کو کرتے دیکھتا ہے تو اُسے یاد آجاتی ہیں۔"

۱۴

(۱۶ر نومبر ۱۹۴۹ء)

اللہ بخشے ایک دیہاتی دوست جو اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ جب

کسی صحبت یا جلسے یا تقریب سے بہت محظوظ ہوتے تھے تو اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنی چودھری زبان میں کہا کرتے تھے "بھئی آج بڑا چکلّس آیا۔" معلوم نہیں "چکلّس"، بہ قول آپ حیات مرحوم کس میوے کی گٹھلی ہے؟ مگر گٹھلی ہے اور بڑی بکٹ ہے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں۔ بہرحال ہمیں اس لفظ کا مفہوم معلوم کرنے کے لئے کبھی لغوی تحقیق کی ضرورت نہیں پڑی، اس لئے کہ مرحوم کو "حالتِ چکلّس" میں دیکھ کر اس کے معنی کی صورت مجسم نظر آجاتی تھی۔ مرحوم کے چہرے کی کیفیت اس وقت ریشہ خطمی اور گل خیرو کے بین بین ہوتی تھی جس میں خوشی کے ساتھ ساتھ کچھ بھولا پن، کچھ کائیاں پن، کچھ بھوچکّا پن کچھ اُچکّا پن ملا جلا ہوتا تھا۔

یہ تمہید اس لئے اُٹھائی یا گانٹھی گئی کہ پاکستان کے ایک اچھے خاصے ثقہ اخبار میں ایک خبر پڑھ کر بڑا "چکلّس" آیا۔ راوی کہتا ہے کہ لائل پور اب شکارپور کا مدمقابل بن کر میدان میں آیا ہے یعنی وہاں ایک انجمن "انجمن احمقاں" کے نام سے قائم ہوئی ہے جس کا یہ دعویٰ ہے کہ پاکستان کی ترقی عقلمندوں کے ذریعے نہیں ہوسکتی، احمقوں کے ذریعے ہوگی۔ خدا جانے یہ خبر سچی ہے یا سیاسی؟ دروغ بر گردن راوی، ہم تو فقط نقل کرنے کے گنہگار ہیں۔ اور نقل را چہ عقل۔

شکارپور کا مقابلہ کرنے کا دعویٰ کوئی اور کرتا تو احمق کہلاتا۔ مگر جو خود ہی اپنے کو احمق کہتا ہو اس کو کیا کہا جائے؟ بہرحال ہم تو یہی کہیں گے کہ لائل پور کا احمق لاکھ احمق سہی۔ ع

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

البتہ حضرات لائل پور اس لحاظ سے ضرور اربابِ شکارپور پر فوقیت رکھتے ہیں کہ وہ الزامی احمق نہیں بلکہ اقبالی احمق ہیں یعنی شکارپوریوں کو تو دوسرے احمق بناتے ہیں اور لائل پوری خود ہی بنتے ہیں، اُن کی یہ اخلاقی جرأت داد کے قابل ہے اور اس میں سوا احمقؔ پھپھوندوی اور حضرت بوّمؔ مرحوم کے کوئی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ہم ان کو مبارکباد دیتے ہیں اور انہیں یقین دلاتے ہیں کہ ان کی حماقت سے پاکستان کا نہ سہی مگر باقی دنیا کے افلاس کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔ سند کے لئے یہ مصرعہ کافی ہے ؎

چو احمق در جہاں باقی است مفلس کس نمی ماند

آپ معاشیات کے جس ماہر سے چاہے پوچھ لیجئے وہ یہی کہے گا کہ مغرب میں مفلسوں کی تعداد اسی نسبت سے گھٹتی ہے جس نسبت سے مشرق میں احمقوں کی تعداد بڑھتی ہے اگر آپ کو یہ خیال ہو کہ احمق کی حماقت سے دوسروں کی دولت میں تو ترقی ہوتی ہے مگر خود بدولت موچی کے موچی رہ جاتے ہیں تو نفسیات کا ماہر آپ کو بتائے گا کہ حماقت کی بدولت آدمی دنیا کی بہت سی فکروں سے آزاد رہتا ہے اور اس کی زندگی بڑے مزے میں کٹتی ہے۔ بقول ہمارے مرحوم دوست کے "بڑا ٹھیکلس آتا ہے" ؎

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ

حماقت بھی بہارِ بے خزاں ہے

اِدھر ہندوستان کی راجدھانی میں یارانِ طریقت نے ایک "انجمن ترقی ظرافت" قائم کی ہے جس کے پہلے جلسے کی صدارت حضرت شنکر رام کارٹونہ نے

فرمائی۔ انھوں نے اپنے صدارتی قہقہے میں اس بات پر روشنی ڈالی کہ ظرافت
کے لئے خوشی اور خوش دلی لازمی نہیں کبھی کبھی بلکہ اکثر ظریف بسورتے ہوئے
دل سے مسکراتا ہے اور دہانِ زخم سے ہنستا ہے، مگر انھوں نے اس
حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ ظرافت کے لئے چاہے خوشی کی ضرورت
نہ ہو مگر حماقت کی بہت سخت ضرورت ہے۔ ترقی دولت سے حماقت
کو جو تعلق ہے وہ تو آپ نے دیکھ لیا۔ اب ذرا یہ بھی دیکھئے کہ ترقی ظرافت
سے اسے کیا تعلق ہے؟ سچ پوچھئے تو ظرافت کا کارخانہ حماقت کے
کچے مال کے بغیر چل ہی نہیں سکتا۔ اگر یہ صنعتی استعارہ آپ کی طبع نازک
پر گراں گزرے تو یوں سمجھ لیجئے کہ ظرافت کا نقش حماقت کے پس منظر
کے بغیر ابھر ہی نہیں سکتا۔ بقول غالب ع

ظرافت بے حماقت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

ہم لائل پور کی انجمن احمقاں اور دہلی کی انجمن ترقی ظرافت دونوں کا خیر مقدم
کرتے ہیں اور یہ دعا کرتے ہیں کہ ہند اور پاکستان کے اینٹھے ہوئے تعلقات
کو درست کرنے کا مسئلہ جسے انجمن اقوام کی حکمت اور فطرت اب تک حل
نہیں کر سکی ہے ان دونوں انجمنوں کی حماقت اور ظرافت سے حل ہو جائے۔

۱۵

یکم دسمبر ۱۹۴۹ء

یوں تو دلی نے اس تین چار برس میں طرح طرح کے کھیل تماشے

دیکھے بڑے بڑے دنگل ہوئے۔ نئے نئے سرکس آئے، لندن کی بڑی پنچایت کی کتھک منڈلی آئی، وزیروں کا طائفہ آیا۔ میاں ماؤنٹ بیٹن آئے، بی آزادی آئیں مگران سب چیزوں کا لطف ہمارے لیڈروں نے اٹھایا۔ ہمارے پلّے تو مار دھاڑ کے سوا کچھ بھی نہ پڑا، ہاں جب کامن ویلتھ سے جو کام روپ سے بھی آگے ہے کرکٹ کے کھلاڑی آئے تو سارے شہر میں ہل چل مچ گئی، ہر طرف چرچا ہونے لگا کہ لو میاں اب مزا آئے گا، گوروں اور کالوں میں سر میدان دو دو ہاتھ ہوں گے اور معلوم ہو جائے گا کہ کون کتنے پانی میں ہے۔

پالی کے دن ساری دلّی کھیل کے میدان کی طرف کھنچی چلی جا رہی تھی ہم جیسے لوگ بھی جو کرکٹ میں بالکل کورے ہیں کھیل کے شوق میں جا پہنچے، کیا دیکھتے ہیں کہ میدان کے بیچ میں تین تین میخیں آمنے سامنے گڑی ہیں دونوں طرف میخوں کے سامنے ایک ایک گورا ہاتھ میں تھاپی لئے کھڑا ہے اور ان دونوں کے آس پاس گیارہ کالے صاحب سارے میدان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اب ہم حیران کہ یہ میخیں کیسی ہیں اور دو اور گیارہ میں مقابلہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جی میں آیا کہ کسی سے پوچھیں، مگر پھر سوچا لوگ ہنسیں گے کہ کرکٹ کی الف، بے تک تو جانتے نہیں اور کھیل دیکھنے کو آموجود ہوئے۔ ذرا دیر دھیرج سے دیکھتے رہیں تو معلوم ہو جائے گا کہ کھیل کا سر کدھر ہے اور دُم کدھر ہے۔ آدمی ہم سمجھ دار ٹھیرے۔ آخر تھوڑی دیر میں تاڑ ہی گئے۔ بات یہ ہے کہ ایک طرف کے

دو آدمی چوڑی چوڑی تھاپیوں سے مسلح ہوتے ہیں اور دوسری طرف کے گیارہ نہتے رہتے ہیں۔ ان گیارہ میں سے دو باری باری سے ان تھاپی والوں کو گیند کھینچ کر مارتے ہیں کہ ان کی ٹانگ یا کمر یا سر توڑ دیں۔ گیند یا جب گیند پھینکتا ہے تو اس کے پاس ایک ڈاکٹر سفید جھاڑ جھولا پہنے زخمیوں کی مرہم پٹی کے لئے کھڑا رہتا ہے۔ سامنے کا تھاپی والا تھاپی سے فقط اپنا بچاؤ نہیں کرتا بلکہ گیارہ نہتوں میں سے کسی کا نشانہ باندھ کر گیند کو اس زور سے مارتا ہے کہ لگ جائے تو بس مزہ ہی آجائے۔ نہتا جس کی طرف گیند جاتی ہے کوشش کرتا ہے کہ صاف بچ جائے اور اگر یہ نہ ہو سکا تو آنکھ ناک بچا کر گیند کو ہاتھ سے روک لیتا ہے۔ اتنی دیر میں دونوں تھاپی والے ادھر ادھر دوڑتے رہتے ہیں۔ کھیل میں بہت سی باریکیاں ہیں جو آپ کو پھر کبھی بتائیں گے۔ اس وقت تو ہم نے موٹی موٹی باتیں بیان کر دی ہیں۔

اب اس دن کے کھیل کا حال سنیئے ہماری طرف کا ہر گیند باز گورے کی کبھی داہنی ٹانگ کبھی بائیں ٹانگ، کبھی کولھے، کبھی گردن کو تاک تاک کر گیند پھینک رہا تھا۔ بڑی ہوشیاری کے ساتھ کہ کہیں میخوں میں نہ لگ جائے نہیں تو گورا سر پیر سلامت لے کر پالے سے چلا جائے گا۔ ادھر تھاپی والا سارے بدن کا زور لگا کر گیند کو تھاپی سے مار کر نہتے ہندوستانیوں کے سینے یا سر پر رسید کرنا چاہتا تھا اور ہمارے بھائیوں کی کوشش یہ تھی کہ انھیں گیند کی ہوا بھی نہ لگنے پائے۔ اس میں شک نہیں کہ گورے تھے بڑے بیچپیت۔ کبھی کبھوے سے چوٹ کھا جائیں تو اور بات ہے نہیں تو

جھٹ پٹ پینترا بدل کر ہمارے وار ہمیں پر اُلٹ دیتے تھے۔ پر ہمارے کھلاڑیوں کا کیا کہنا۔ بڑی پھرتی سے گیند کو جھکائی دے کر بے داغ بچ جاتے تھے اور وہ بھنّاتی ہوئی پالے کے باہر چلی جاتی تھی۔ بہت کم ایسا ہوا کہ گیند کو ہاتھ سے روکنے کی نوبت آئی ہو۔ اب رہی چوٹ تو ایک کے سوا کسی کا بال تک بیکا نہیں ہوا۔ غرض گوروں کا گیند کو تھاپیوں سے مارتے مارتے اور میخوں کے درمیان اِدھر اُدھر دوڑتے دوڑتے پلیتھن ہی تو نکل گیا۔ فقط دو بار ہمارے گیندیوں سے چوک ہوگئی۔ گیند اُن کے ہاتھوں سے چھوٹ کر میخوں میں جا لگی اور دو گورے جان بچا کر میدان سے رفوچکّر ہوگئے باقی دو کو ہمارے نہتّے کھلاڑیوں نے ایسا رگیدا، ایسا رگیدا کہ پناہ مانگنے لگے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو سیکڑوں بار انھیں میخوں سے میخوں تک ڈبل مارچ دلیل کرنی پڑی۔ سورج ڈوبنے لگا تو ان کی جان چھوٹی۔ کھیل ختم ہوا، ہم خوش خوش گھر آئے کہ چلو میاں آج کرکٹ بھی دیکھ لیا۔

۱۶

(۱۶ دسمبر ۱۹۴۹ء)

حضرت دیوان غالب نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ظاہر ہے کہ "محشرِ خیال" محض دھونس جمانے کی ترکیب ہے۔ مطلب دراصل یہ ہے کہ ہر شخص اپنی جگہ ایک "بزمِ بے تکلف" ہے۔ اکیلا بیٹھا ہو تب بھی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے من کے اندر ایک انجمن سجی ہوئی ہو۔ ابھی پرسوں کا ذکر ہے ہم گھر سے روٹھ کر جنگل کی طرف نکل گئے۔ جنگل تو شیخ جی کی چُگّی داڑھی کی طرح کچھ یوں ہی سا تھا مگر سنّاٹا غضب کا تھا۔ انسان کا تو کیا ذکر ہے کوئی قیس تک نظر نہ آیا کہ ہم اپنے آپ کو یہی کہہ کر تسکین دیتے ع
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

ہم نے سوچا خیر دو نہ سہی ایک ہی سہی ذرا بیٹھ کر تو دیکھیں کیسی گزرتی ہے۔ یوں بھی تھوڑی سی دیر میں صحرا نوردی کا مزا اچھی طرح چکھ چکے تھے جوتے کی کیلیں خارِ مغیلاں کا کام دے رہی تھیں۔ خیر ایک جگہ چھاؤں گھنی دیکھ کر جا بیٹھے اور جن خیالات میں دیر سے غوطہ کھا رہے تھے ان میں بالکل ڈوب گئے۔ اب آپ مانیں یا نہ مانیں مگر ہمیں یہ احساس ہوا کہ ہمارے اندر "ایک" میں" نہیں بلکہ کئی "میں" ہیں اور ان میں آپس میں تُو تُو میں میں ہو رہی ہے۔ گفتگو لمبی تھی جو تھوڑی بہت یاد رہ گئی ہے آپ کو سُناتے ہیں :۔

ا۔ بھلے آدمی تجھے شرم نہیں آتی اپنا سارا وقت بے کار کھوتا ہے جب دیکھو بیٹھا اونگھ رہا ہے یا گپ شپ کر رہا ہے۔

ب۔ کیا خوب! وہ بے چارہ مشاہدۂ نفس میں مصروف ہو تو تمہارے نزدیک اونگھنا ہوا۔ مبادلۂ خیال کرے تو گپ شپ ٹھہری۔

ج۔ اجی رہنے بھی دو یہ روحانی رتوندی کا مریض بھلا کیا مشاہدۂ نفس کرے گا اور مبادلۂ خیال کی بھی ایک ہی کہی۔ اس کے خیالات وہ کھوٹے سکّے ہیں جنھیں کوئی ٹکے کو نہیں پوچھتا۔ گھوم پھر کر اُسی کے پاس آجاتے ہیں۔

د۔ میاں اصل بات یہ ہے کہ اس بے روزگاری کے زمانہ میں بچارا کرے تو کیا کرے۔

ا۔ کرے یہ کہ ہاتھ پاؤں ہلائے۔ دوڑے دھوپے۔ روزگار نہ سہی اس کی تلاش ہی سہی، کچھ شغل تو ہو۔ بیٹھا مکھیاں تو نہ مارے

ب۔ افسوس اس زر پرست دنیا میں زر کی تلاش میں مارا مارا پھرنا بھی مفید شغل سمجھا جاتا ہے۔ مگر بیٹھ کر مکھیاں مارنا جس سے حفظانِ صحت میں مدد ملتی ہے بے شغلی کہلاتا ہے۔

ج۔ ارے تو یہ کوئی سچ مچ کی مکھیاں تھوڑی ہی مارتا ہے۔ خیالی مکڑی کا جالا بُن کر خیالی مکھیوں کا شکار کرتا ہے۔

د۔ بھئی ذرا تو ترس کھاؤ اس بچارے پہ جسے زمانے کی چکّی نے پیس ڈالا ہے۔

ا۔ اس نالائق نکمّے نکھٹو کو تم بچارا کہتے ہو۔ ہٹا کٹا آدمی مزدوری بھی کرتا تو پیٹ بھرنے کو مل جاتا۔ دوسروں کے لئے نہ سہی کم از کم

اپنے لئے تو کچھ کرے۔

ہم یہ بکواس سُن کر دل ہی دل میں کھول رہے تھے۔ آخر ضبط نہ ہوا اور ہم نے بگڑ کر کہا "ایسے نالائق نکمے نکھٹو کے لئے جیسے کہ ہم ہیں ہم کیوں کچھ کریں؟ مانگنے دو بھیک، کرنے دو فاقے۔ ہماری جوتی سے!"
اس کے بعد سناٹا چھا گیا، سنسان جنگل تھا اور ہم تھے۔

۱۷

(۲۴ دسمبر ۱۹۴۹ء)

"خیر تو ہے شیخ جی، آپ کچھ پریشان سے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا نصیبِ دشمناں منجھلی بکری کی طبیعت پھر کچھ ناساز ہو گئی؟"

"نہیں جی بکریاں تو خدا کے فضل سے سب اچھی ہیں۔ یہ بکری کی بیماری نہیں آدمی کا آزار ہے جس نے ناک میں دم کر رکھا ہے!"

"آدمی کی نہ کہئے اس نے تو اللہ میاں کا بھی ناک میں دم کر دیا۔ ایسا ظلوماً جہولاً تو آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔"

"کیا خوب! آپ بھی کیا سمجھے ہیں۔ بھلے آدمی آخر آدمی کے بشر سوا کچھ اور بھی تو معنی ہیں؟"

"اچھا سمجھ گیا، میں نہیں جانتا تھا کہ آپ بھی اہل پنجاب کی طرح

آدمی کو مرد کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔"

"ارے مرد آدمی کچھ تو عقل سے کام لے۔ میں کوئی عورت ہوں جو مرد کے ظلم کی فریاد کرتا پھروں گا؟"

"یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔"

اب تو مجھے یہ شبہہ ہوتا ہے کہ تم حماقت سے نہیں شرارت سے کام لے رہے ہو۔ تمہیں نہیں معلوم کہ آدمی نوکر کو کہتے ہیں؟"

"ارے توبہ! آپ نوکر کا ذکر کر رہے تھے۔ مگر شیخ جی آپ کا نوکر تو دیکھنے میں آپ سے بھی زیادہ جنتی معلوم ہوتا ہے۔ اس سے آپ کا ناک میں دم کیسے آگیا؟"

"تم گھسیٹے کو کہہ رہے ہو۔ وہ بچارا تو کئی مہینے ہوئے مر گیا۔"

"افسوس کہ موت نے گھسیٹا ع

پھر اب مرحوم کی گدّی کس نے سنبھالی ہے؟"

"اسی کا ایک بھتیجہ ہے وفاتی۔ مگر جتنا وہ مستعد اور بے عذر تھا اتنا ہی یہ مگرا اور حجّتی ہے۔ فرماتے ہیں میں بکریاں نہ چراؤں گا۔ یا تو گھر کا کام کرا لیجئے یا بکریاں چروا لیجئے۔ اب بتائیے میں کیا کروں۔ اس عمر میں خود بکریاں چراؤں؟"

"خیر عمر کی تو کوئی بات نہیں۔ آخر گھسیٹے مرحوم بھی آپ کی طرح پچاس کے لگ بھگ تھے اور بکریاں چراتے تھے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کا بہ ایں ریش وفش بکریوں کی صحبت میں دکھا جانا مناسب

نہیں ۔ لوگ نہ معلوم کیا سمجھیں ؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ آزادی شریفوں کی کیا درگت بنائے گی آدمیوں کو ایسے دن لگے ہیں جیسے وہ آقا ہوں اور ہم نوکر۔"

"شیخ جی ! آزادی بچاری سے آپ کیوں خفا ہیں ۔ نوکر شاہی تو انگریزوں کے زمانے سے چلی آتی ہے ۔ مگر ایک بات پوچھوں انصاف سے کہئے گا ۔ آپ کسی آدمی سے یہ توقع کیسے کر سکتے ہیں کہ صبح اٹھ کر آپکے بچوں کے پوتڑے دھوئے ۔ آپ کے نشے پانی کا سبیتا کرے ، ناشتہ تیار کرے ، برتن دھوئے ، مسالہ پیسے ، بازار سے سودا لائے ۔ کھانا پکائے ۔ دوپہر سے ڈنڈا لئے بکریوں کے پیچھے پیچھے پھرے ، کسانوں اور مالیوں سے جھک جھک کرے اور شام کو گھر آئے تو وہی صبح کا سا چکر آدھی رات تک چلتا رہے ۔ آدمی نہ ہوا گھن چکر ہو گیا ۔"

"تو یہ کوئی انوکھی بات تھوڑا ہی ہے ۔ آخر گھسیٹے مرحوم بھی تو آدمی تھا ۔ وہ یہ سب کام کرتا تھا یا نہیں ؟"

"شیخ جی ! آدمی تو تھا مگر یہی سب کام کرتے کرتے بچارا مرحوم ہو گیا ۔ آپ چاہتے ہیں کہ وفاتی بھی جلدی سے وفات پا جائے ؟"

"موت زندگی تو خدا کے ہاتھ ہے ۔ اس پر کس کا اختیار ہے ؟"

"شیخ جی یہ اختیار کبھی کبھی بندے کی طرف بھی منتقل ہو جاتا ہے ۔ جو شخص ایک گوشت پوست کے انسان سے مسلسل اٹھارہ گھنٹے کام لے وہ ملک الموت نہیں تو اس کا داہنا ہاتھ ضرور ہے ۔"

"توبہ! تم نے تو میرا دل ہلا دیا مگر کام تو آخر ہونا ہی ہے۔ میں کروں تو کیا کروں؟"

"ہم بتائیں۔ آپ یہ کیجیے کہ آدمی کو آدمی سمجھئے، خود بھی آدمی بن جائیے اور اس کا بوجھ بٹائیے۔"

۱۸

(۸ر جنوری ۱۹۵۸ء)

"کیوں صاحب۔ یہ جو کہا کرتے ہیں:۔

"آدمی پہچانا جاتا ہے قیافہ دیکھ کر"

اس سے کیا مطلب ہے۔ قیافہ کیا چیز ہے؟"

"آپ قیافہ نہیں جانتے، ارے بھائی لفافے کا قافیہ ہے:۔

خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر"

"آپ بھی عجیب آدمی ہیں، میں مطلب پوچھ رہا ہوں اور آپ ڈھل قافیہ ہانک رہے ہیں۔"

"ہائے افسوس سائینس کی تعلیم نے آپ کا ادبی ہاضمہ اتنا کمزور کر دیا ہے کہ کوئی چیز پچتی ہی نہیں۔ میں چاہتا تھا کہ آپ دوسرے مصرعے کے چورن سے پہلا مصرع ہضم کر لیں۔ مگر آپ کو تو اور قرا قر ہونے لگا۔

اچھا اب سُنیے قیافہ چہرے مہرے کو کہتے ہیں۔ اور اس علم کو بھی جس کے ذریعے سے ہم آدمی کا چہرہ مہرہ دیکھ کر اس کی طبیعت اور سیرت کا اندازہ کرتے ہیں۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ اس اٹکل پچو اندازے کو جو کبھی صحیح ہوتا ہے اور کبھی غلط آپ علم کہتے ہیں۔ خیر اب تو یہ بتائیے کہ چہرے کے ساتھ آپ نے جو مہرے کا لفظ استعمال کیا اس کے کیا معنی ہیں؟"

"واللہ بس سائنس دانوں کی یہی ادا ہمیں پسند ہے۔ کوئی چیز بھی ہو ہندی کی چندی نکالے بغیر نہیں رہتے۔ آپ کے سامنے کہتے ڈر لگتا ہے مگر جہاں تک میری "لغویاتی" تحقیق ہے مہرہ ناک کو کہتے ہیں جو چہرے کا سب سے نمایاں حصّہ ہے اور جس سے آدمی کی سیرت کا پتہ چلانے میں سب سے زیادہ مدد ملتی ہے۔"

"لیجئے اور سُنیے۔ چہرے سے تو خیر کچھ تھوڑا بہت اندازہ ہو بھی سکتا ہے۔ ناک سے بھلا سیرت کا کیا پتہ چلے گا کس قدر مہمل بات ہے۔"

"دیکھئے صاحب اب آپ بہت بڑھ چلے ہیں۔ یہ آپ کی بڑی ناسائنسی ہے کہ ایک چیز کو سمجھے اور جانچے بغیر مہمل کہہ دیں۔ میں پوری ذمہ داری سے ایک علمی مفروضہ یعنی ہائی پاتھسس کے طور پہ آپ کے سامنے یہ خیال پیش کرتا ہوں کہ ناک آدمی کی سیرت کی کنجی ہے۔ پہلے آپ اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ پھر تجربے کی کسوٹی پہ کسیئے۔ اس کے بعد آپ کو تردید یا تائید کرنے کا حق ہوگا۔ ماہرین خرافات کا خیال ہے کہ

انسان کی سیرت پر اس کے دورانِ خون کا اور دورانِ خون پر طریق تنفس کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ طریق تنفس بڑی حد تک اس آلۂ شامہ کی ساخت پر موقوف ہے جسے عرف عام میں ناک کہتے ہیں۔ اس وقت میں نظری تفصیلات کو چھوڑ کر عملی نتائج کا ذکر کرتا ہوں جو اس مفروضے کی بنا پر مشاہدے کے ذریعے حاصل کئے گئے ہیں۔ ماہرین قیافہ بینی نے ناک کی حسب ذیل قسمیں قرار دی ہیں اور ہر قسم کو انسان کی طبیعت کے ایک خاص رجحان کا نمایندہ قرار دیا ہے۔

افسوس ناک، شرمناک، یا نمناک ان لوگوں کی ہوتی ہے جو برے کرتوت کرتے ہیں اور پھر ان پر پچھتاتے ہیں عموماً ان کی ناک کی نوک پر عرق انفعال کے قطرے جھلکتے ہیں جنھیں شان کریمی موتی سمجھ کر چن لیتی ہے۔

دردناک یا غمناک عام طور پر شدت الم سے سرخ اور دفور رقت سے بہتی رہتی ہے خلقی بے بسی اور مظلومی ظاہر کرتی ہے۔

اندیشہ ناک یا خطرناک وہ ہے جو خطرے کو دور سے سونگھ کر سکڑنے اور پھڑپھڑانے لگتی ہے۔ بزدلی کی علامت ہے۔

ہولناک یا وحشت ناک وہ بھیانک دوراہہ جس کی شان میں شاعر نے کہا ہے ع دو نتھنے راہ عدم کے ناکے

اس کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ اس کے اندر سے سوں سوں کی جگہ سائیں سائیں کی آواز آتی ہے۔ کمبھ کرن کے جسم اور راون کی روح کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

غضب ناک چڑھی ہوئی، پھن پھناتی ہوئی، آگ برساتی ہوئی کمزور طبیعت والوں کی جنھیں ضعف کی شدت سے اتنی برداشت نہیں ہوتی کہ ناک

پر کبھی بیٹھنے دیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ غصّے کے گھوڑے پر چڑھے ہیں حالانکہ در اصل غصہ ان پر چڑھا ہوتا ہے۔

عبرت ناک پوری یا آدھی کٹی ہوئی، اُن من چلوں کی جو طلاق کے مقدموں میں مدعاعلیہ یا فوج داری کے مقدموں میں مستغیث ہوتے ہیں۔

طرب ناک یا فرح ناک گل زنبق کی طرح کھلی ہوئی ہنستی ہنساتی ہوئی۔ بزم بے تکلف کے بادہ نوشوں کی جو زندگی کی تلخ کامیوں کو دور کرنے کے لئے خوش طبعی کی مے شیریں کے دو گھونٹ غنیمت سمجھتے ہیں اور مزے لے لے کر پیتے ہیں۔"

۱۹

۸ / اپریل ۱۹۵۰ء

کبھی آپ کو یہ اتفاق ہوا ہے کہ ایک شخص جو دیکھنے میں عاقل و بالغ معلوم ہو ایسی نامعقول حرکت کر بیٹھے کہ جی جل کر سلفہ ہو جائے، آپ یہ سمجھیں کہ اُسے سختی سے ٹوکنا بلکہ اسے ٹھوکنا چاہیئے مگر آپ دل ہی دل میں کڑھتے رہیں اور ہاتھ اٹھانا تو درکنار زبان تک نہ ہلا سکیں، اگلے زمانے میں اسے مروت کہتے تھے، مگر آج کل کے طبیب اسے ضعف اعصاب کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ اعصاب بھی عجیب و غریب ہیں جب کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے تو کڑی کمان کی طرح کھنچ جاتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اس کمان سے تیر اب چھوٹا۔

اب چھوٹا، مگر عین وقت پر ـــــ ٹائیں ٹائیں فش۔

ابھی کل کی بات ہے کہ ہم اپنے دفتر میں رعب دار چہرہ بنائے، تیوری پہ بل ڈالے اینٹھے ہوئے بیٹھے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح بیٹھنے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے پٹھے دکھنے لگتے ہیں۔ ہڈ یاں بول اٹھتی ہیں مگر کیا کیا جائے کہ اس یوگ کے آسن کے بغیر کم بخت چپراسی ہم جیسے کمزور آدمی کا رعب مانتا ہی نہیں۔ ہم ذرا ڈھیلے پڑے اور وہ سر پہ چڑھا۔ خیر تو ہم اس شان سے بیٹھے تھے کہ ہمارے ایک مہربان لحیم، شحیم، ضخیم، فخیم جنھیں ہماری آپ کی زبان میں "خواہ مخواہ مرد آدمی" کہتے ہیں آ دھمکے اور بڑی بے تکلفی سے سامنے والی کرسی سے میز تک دراز ہو گئے ـــــ یعنی انھوں نے کرسی کے بازوؤں پر ہاتھ رکھ کر اور اس کی پشت سے پیٹھ لگا کر اسے پیچھے کو جھکا دیا۔ پاؤں پھیلا کر میز سے لٹکا دیے اور لگے جھولا جھولنے۔ اب ہمارا غصے اور شرم [illegible] برا حال کہ جی چاہتا تھا زمین پھٹے اور ـــــ اور یہ حضرت کرسی [illegible] اس میں سما جائیں، ہم نے کنکھیوں سے چپراسی کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ صاف کہہ رہا تھا کہو "بابو صاحب اب کیا رہ گئی؟" اپنے دھم دھوسڑ دوست کو لاکھ اشارے کیے کہ اس ہنگم ٹھاٹھ کو بدلو، یہ سرکس کا تماشہ موقوف کرو مگر ظاہر ہے کہ اتنی عقل ہوتی تو اتنی ـــــ کیسے چڑھتی۔ سوچتے سوچتے ایسی ترکیب دھیمی کلاہم پھڑک اٹھے۔ ہم نے دل میں کہا ہم الماری سے کاغذ نکالنے کے بہانے اٹھیں اور اس انسان نما ہنڈولے کے پاس سے گزرتے ہوئے بے خیالی میں کرسی کے ہتھے سے ٹھکر جائیں۔ بس پھر خود بخود توازن بگڑ جائے گا اور

بات بن جائے گی۔ ایک نئی افتاد میں حضرت عمر بھر کے لئے نشست و برخاست
کے آداب سیکھ جائیں گے اس خیال کے آتے ہی اعصاب کی کمان کھنچ گئی
اور یہ معلوم ہوا کہ تیر اب چھوٹا، اب چھوٹا، مگر افسوس عین وقت پر ـــــ
ٹائیں ٹائیں فش ۔

۲۰

۸ مئی ۱۹۵۰ء

جب زمانے کا رنگ بدلتا ہے، حکومت کا چولا بدلتا ہے۔ افسروں
کی نیت بدلتی ہے، دوستوں کی نظریں بدلتی ہیں، دشمنوں کے پینترے بدلتے
ہیں سکّے کی قیمت بدلتی ہے شہروں کے نام بدلتے ہیں تو پھر لفظوں کے معنی کیوں نہ
بدلیں؟ اب لغت کی پرانی کتابوں کو تو بالائے طاق رکھئے اور ہماری یہ
"نئی روشنی" کی ڈکشنری سے فائدہ اٹھا سکیں تو فائدہ نہیں تو کم سے کم لطف ہی اٹھایئے۔

آبادی۔ وہ ہے جس کے لئے ملک کی تقسیم ضربِ شدید کا کام دیتی ہے۔
جس کے مبادلے میں اتنا بٹّہ لگ جاتا ہے کہ بدل کچھ نہیں رہتا
کہا جاتا ہے کہ پہلی بار گیہوں کھانے سے بڑھنی شروع ہوئی تھی مگر اب
گیہوں ملے یا نہ ملے بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ فطرت اور سائنس مل کر اسکے
گرانے کے لئے تین سو انسٹھ داؤں چلتی ہیں۔ مگر اسے انسانی جبلت نے

ایک پیچ ایسا بتا دیا ہے کہ کشتی اسی کے ہاتھ رہتی ہے۔

اپیل۔(۱) جو عدالت سشن سے خارج اور ہائی کورٹ سے منظور ہو جاتی ہے
(۲) جو والنٹیروں کے لئے کی جائے تو کامیاب اور چندے کے لئے کی جائے تو ناکام رہتی ہے۔

اچار یہ۔ دو قسم کا ہوتا ہے، کھٹا اور میٹھا۔ کھٹا کانگریس پارٹی کے حلق میں پھنس جاتا ہے اور میٹھا سوشلسٹ پارٹی کے گلے اتر جاتا ہے۔

ادب۔ پرانا برائے ادب اور نیا برائے زندگی کہلاتا ہے مگر حقیقت میں پرانا برائے نام اور نیا برائے بیت ہوتا ہے۔

اردو۔ وہ زبان جو بتیس دانتوں میں رہ کر سلامت ہے اور رہے گی۔ وہ شیریں جس کے نخرے آج خسرو سے نہ اٹھے تو کل فرہاد اٹھائے گا۔

نماند ناز شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد کوہ کن ہست

آزادی۔ وہ صبح وصل جس کے انتظار میں ہجر کی ہزاروں راتیں تڑپ تڑپ کے کٹیں اور جس کے آتے ہی اپنی تو بھور ہو گئی۔

اقلیت۔ وہ ناشکری جماعت جو ہندوستان اور پاکستان میں تمام آئینی تحفظات کے باوجود محض جان و مال کے نقصان سے تنگ آ کر یہ فریاد کرتی رہتی ہے۔

شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

اکثریت۔ جو ظلم کبھی نہیں کرتی صرف ہندوستان کے ظلم کا پاکستان میں اور

پاکستان کے ظلم کا ہندوستان میں بدلہ لیتی ہے یہ بات اور ہے کہ بدلہ اکثر پیشگی لے لیتی ہے۔

الیکشن۔ جس میں ووٹ کی کمی سے ہارنے والے کی ضمانت ضبط اور خرچ کی زیادتی سے جیتنے والے کی عقل خبط ہو جاتی ہے۔

آمدنی۔ جو خرچ کے پیچھے دوڑتی رہتی ہے، مگر اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچتی۔

امریکہ۔ وہ صیّاد جس کے تیرِ زرّیں کا نشانہ راہب ردا سے لے کر شیخ خرم تک کون ہے جو نہ ہو۔

ڈالر نے جس کے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں

امن۔ جس کو کبھی خواب میں دیکھا تھا اور جس کا اب خواب دیکھا کرتے ہیں۔

اناج۔ جس کی پیداوار اور قیمت خدا کے فضل سے اور سرکار کے اقبال سے روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔

انکم ٹیکس۔ جو امیروں پہ تشخیص ہوتا ہے۔ متوسط طبقے پہ عائد ہوتا ہے اور غریبوں سے وصول کیا جاتا ہے۔

اہنسا۔ جو انگریز سے بے ہتھیار کے کی گئی اور ایک دوسرے پہ چاقو لاٹھی اور گولی سے کی جاتی ہے۔

۲۱

۱۶ مئی ۱۹۵۰ء

"کہو لالہ کیا حال چال ہے"

"سب آنند ہے سرکار، اپنی ٹکے گز کی چال سے چلے جا رہے ہیں"

"بھئی تمہارے مزے ہیں، کوئی زمین داری کے غم میں مرا جاتا ہے، کسی کو دس سال کا لگان بھرنے کی فکر کھائے جاتی ہے۔ مگر تم ہو کہ آرام سے دکان پر بیٹھے ڈنڈی مارتے اور روپیہ بٹورتے رہتے ہو"

"دکان میں کیا رکھا ہے سرکار۔ کنٹرول کے بھاؤ بیچو تو روپے پیچھے دونی کا بھی لابھ نہیں اور چور بازاری کرو تو ادھر پولیس والوں کی مٹھی گرم کرنا ادھر راشن والوں کا پیٹ بھرنا اور پھر اوپر سے پرائشچت کی کر لگ گئی تو سُلفہ ہی ہو جاتا ہے"

"یہ پرائشچت کا کیا ڈھونگ ہے لالہ۔ سال بھر تک غریبوں کو ٹھگ ٹھگ کے اپنی گلک بھرتے رہے اور ایک دن بھگوان کے نام پر چار پیسے کا دان دے دیا بھلا اس سے کہیں پاپ کی کلنک مٹتی ہے"

"بھگوان پیسوں کو نہیں گنتا من کی بھاؤنا کو دیکھتا ہے۔ چار پیسے ہوں کہ چار توڑے، جس نے سچے دل سے دان کر دیئے، اس کا بیڑا پار ہو گیا۔ سال بھر کیا، عمر بھر کے پاپ دم بھر میں دُھل جاتے ہیں۔ اب رہی غریبوں کو ٹھگنے کی بات سو غریب امیر کا بھید دنیا کرے دنیا کبھی نہیں کرے گا۔ وہ تو سب کو ایک ہی تک پر تولتا ہے"

"اور ایک ہی بھاؤ بیچتا ہے۔ مگر لالہ بگلا بھگت تو بہت دیکھے تھے۔ یہ بنیا بھگت نیا جنور دیکھنے میں آیا ہے۔ دھرم کا دھندا، بیوپار کی طرح کرتا ہے اور اس سے دل کھول کر لابھ اُٹھاتا ہے۔ جس مالا پہ رام رام جپتا ہے اُسی پر جوڑتا جاتا ہے کہ رام سے اتنا بھر پایا، اتنا اُدھار رہا، اور اس پہ اتنا بیاج ہوا۔ گاندھی میموریل فنڈ میں چند لاکھ کا چندہ اس لئے دیتا ہے کہ پرلوک میں مُکتی ہو جائے اور اس لوک میں کروروں انکم ٹیکس بچ جائے۔ شنرنارتھیوں کو ٹکے اس لئے بانٹتا ہے کہ دنیا میں نام ہو، من کو شانتی ہو اور الکشن میں ووٹ ملیں۔"

"ہم سمجھ گئے۔ سرکار کس دھنا سیٹھ کا ذکر کر رہے ہیں مگر اس کو بنیا کہہ کر بنیوں کا نام تو نہ بدنام کیجیے۔ بنئے میں بڑی سمائی ہوتی ہے سرکار۔ جس کے پاس پیسہ اچھلنے لگے، جو مول بیاج کا بیورا پھیلاتے پھیلاتے راج کاج کا سپنا دیکھنے لگے وہ اصلی بنیا نہیں رہا۔ بناسپتی ٹھاکر ہو گیا۔"

"مگر لالہ یہ تو کوئی نئی بات نہیں کہ بنیے حکومت کا خواب دیکھیں۔ آخر ہمارے دیس میں ہیمو بقال بھی گذرا ہے۔"

"گذرا نہیں سرکار، اگیا گذرا کہئے، ہم نے بھی آپ کی دُعا سے ورنا کیولر مڈل میں تاریخ پڑھی تھی۔ امتحان میں تو رہ گئے پر اتنا سبق سیکھ لیا کہ بنئے کی حکومت تلوار کے زور سے نہیں۔ بہی کھاتے کے بل پر ہوتی ہے۔ ہیموں بچارا کیا راج کرتا، راج تو ٹوڈرمل نے کیا ہے۔ اکبر بادشاہ کے حصّے میں تو حکومت کی شان ہی آئی تھی، جان ٹوڈرمل کی مٹھی میں تھی اگر ہمارے دھنا سیٹھ میں ذرا سی بھی سُدھی ہوتی تو ہیموں کی جگہ ٹوڈرمل کی ریس کرتا۔"

"بھئی واہ لالہ تم بڑے تاریخ داں نکلے۔ مگر یہ تو کہو ٹوڈرمل آج کل کے زمانے میں ہوتا تو کیا کرتا۔ ہمارے دیس میں تین سال میں تین ارتھ منتری بدل چکے ہیں، آخر ٹوڈرمل کتنے دن ٹکتا؟"

"آج کل کے ٹوڈرمل ارتھ منتری نہیں بنا کرتے، بنایا اور بگاڑا کرتے ہیں۔ ایک بات یاد رکھئے گا سرکار۔ اصلی بنیا ہمارے دھنّا سیٹھ کی طرح اتھلا نہیں ہوتا، اس کی تھاہ آج تک کسی نے نہیں پائی۔"

۲۲

۲۴ مئی ۱۹۵۶ء

'کیا فرمایا آپ نے ہمارے دیس میں آزادی کہاں ہے؟ قربان اس تجاہل عارفانہ کے۔ اے حضرت میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ ہمارے دیس میں وہ کون سا گوشۂ عافیت ہے، جہاں آزادی نہ ہو۔ گھر میں، گلی میں، سڑک پر، بس میں، ٹرام میں، ہر جگہ آپ کے حواس خمسہ آزادی کی زد میں ہیں، کہیں اس سے مفر نہیں۔

وسط مئی کی چپکے چپکے سلگتی ہوئی رات ہے، دھیمی دھیمی گنگنی ہوا چل رہی ہے، ہلکا ہلکا سلونا پسینہ بہہ رہا ہے۔ آپ راشن کا چار گرہ کپڑا کمر میں باندھے کھری چارپائی پر پڑے کروٹیں بدل رہے ہیں۔ ذرا آنکھ جھپکتی ہے کہ پنچم کے سروں میں ایک گھن گرج آواز کی چوٹ کان کے پردے پر اس زور سے پڑتی ہے جس سے روح کا ہر تار اور جسم کا ہر پٹھا لرز اٹھتا ہے۔ گھبرائیے

مت یہ زلزلے کی گڑگڑاہٹ نہیں ہے۔ آپ کا ہمسایہ آزاد بھارت کا آزاد شہری، حلق اور پھیپھڑے کی آزادی سے کام لے رہا ہے اور محلّے والوں کی نیند کو موسیقی کی دیوی کے چرنوں پر بھینٹ چڑھا رہا ہے۔

ساری رات آنکھوں میں کاٹنے کے بعد صبح تڑکے آپ پلنگ سے اُٹھتے ہیں اور جلدی جلدی کرتا چپّل پہنتے ہیں کہ ندّی پر جاکر غسل کریں۔ دروازہ کھول کر گلی میں قدم رکھتے ہی ایسا زنّاٹے کا بھبکا آتا ہے کہ مشامِ جاں تڑپ اُٹھتا ہے۔ گلی میں جابجا آزادی کے نتائج و عواقب کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں جن سے مناسب وقت پر کھیتوں میں غلّے کی پیداوار بڑھانے کا کام لیا جائیگا۔

ندی پر پہنچ کر سب سے پہلا منظر جو آپ کی نظروں کو کھینچتا ہے اور کھینچتے ہی ڈھکیل دیتا ہے یہ دکھائی پڑتا ہے کہ کنارے کے قریب با اقتدار، عمومی جمہوریۂ ہند کے ارکان ایک لمبی سی قطار میں اکڑوں بیٹھے ہوئے آزادیٔ عمل کے بنیادی حق کا استعمال کر رہے ہیں۔ آپ منہ پھیر کر لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں اس لئے کہ آپکو بھی غسل سے پہلے اس کارِ ضروری سے فراغت پانی ہے۔ مگر ایسی جگہ کی تلاش ہے جہاں کوئی رفیق کار نہ ہو۔ جہاں آپ اجتماعی پہلو سے صرف نظر کرکے یہ کام انفرادی پہلو سے انجام دے سکیں۔

نہادھوکر لوٹتے لوٹتے دھوپ چڑھ آئی ہے۔ آپ کا قدم ذرا آہستہ پڑ رہا ہے۔ آپ سوچتے ہیں "مدرسہ صبح کا ہے ...... ابھی گھر جاکر ناشتہ کرنا ہے ...... کہیں دیر نہ ہو جائے ...... آؤ ٹرام میں چلے چلیں" مگر اکنّی خرچ کرتے ہوئے بھی دل دکھتا ہے۔ اتنے میں ٹرام نظر آتی ہے آپکے

قدم بے اختیار اُٹھ جاتے ہیں اور قدم سے دُلکی، دُلکی سے سرپٹ تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اب آپ آزادی کی ترنگ میں چلتی ٹرام کا ڈنڈا پکڑ کر اُچکنا چاہتے ہیں۔ اتنے میں پیچھے سے دھکا لگتا ہے اور آپ مُنہ کے بل زمین پر آ رہتے ہیں، سنڈی مُسٹنڈی آزادی کمزور مریل آزادی کو گرا کر ٹرام پر چڑھ جاتی ہے۔

آپ ابھی کھڑے ہو کر اچھی طرح دُھول بھی نہیں جھاڑنے پاتے کہ کوئی دو فرلانگ سے صورِ اسرافیل کی آواز سُن کر اُچھل پڑتے ہیں۔ لیجئے آخر قیامت آ ہی گئی۔ مگر پھر فوراً خیال آ جاتا ہے ع

یہ بس آ رہی ہے قیامت نہیں ہے

اس وقت سڑک پر کوئی اور سواری موٹر، تانگہ، چھکڑا نہیں ہے پیدل چلنے والے بھی کم ہی ہیں۔ پھر بھی بس کا ڈرائیور پوری طاقت سے مسلسل ہارن بجا رہا ہے ورنہ اس کی آزادی میں بٹّہ لگ جائے مگر ایک بڑے میاں یہ سمجھتے ہیں کہ آزادی کا اصلی مزا سڑک کے بیچوں بیچ چلنے میں ہے بہر حال ان کی وجہ سے یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ بس کے ہارن کا چیختے چیختے گلا بیٹھ جاتا ہے۔ بس رُک جاتی ہے اور آپ لپک کر چڑھ جاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ تین تین آدمیوں کے سیٹ پر دو دو آدمی آزادی سے پھیل کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ بڑی مشکل سے دو کے بیچ میں گھس بیٹھ کر پیندا ٹکاتے ہیں تو راستے بھر یہ حالت رہتی ہے کہ اِدھر اُدھر سے دوہری آزادی کا دباؤ آپ کا کچومر نکالے دیتا ہے۔

۲۳

۱۶ر جون ۱۹۵۰ء

"تم سے ہزار بار کہہ دیا کہ صبح صبح ہمیں نہ ستایا کرو ورنہ یاد رکھو کسی دن۔"
"توبہ کیجئے میر صاحب، میں اور آپ کو ستاؤں۔ بھلا یہ بات عقل میں آتی ہے؟"
"عقل میں آئے یا نہ آئے عمل میں تو آتی ہی رہتی ہے۔"
"یہ کیسے ممکن ہے۔ جدید فلسفہ کہتا ہے کہ عادت کبھی عقل کے خلاف نہیں ہو سکتی۔"
"جدید فلسفہ جھک مارتا ہے۔ تمہاری جتنی عادتیں ہیں سب عقل کے خلاف ہیں۔"
"اچھا آپ تو یہ بتائیے کہ صبح کے وقت ستایا جانا آپ کو کیوں بُرا لگتا ہے؟"
"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمیں قبض کا مرض ہے اور ہم نے آزما کر دیکھا ہے کہ صبح کو جی خوش ہو تو کارروائی آسانی سے ہو جاتی ہے۔ اور جو طبیعت میں انقباض پیدا ہو گیا تو معاملہ اٹک اٹک کر رہ جاتا ہے۔"
"تو یہ کہئے کہ صبح بوہنی کے وقت ٹوکنا نہیں چاہئے ورنہ السیٹھ ہو جاتی ہے۔ مگر میر صاحب آپ کو برسوں سے یہ نامراد مرض ہے اور آپ نے کوئی علاج نہیں کیا۔"
"سچ کہتا ہوں بس یہ جی چاہتا ہے کہ سر پیٹ لوں۔ غضب خدا کا یہاں

ساری عمر حکیموں، ڈاکٹروں کے چکر میں گذری۔ دواؤں کے مارے پیٹ عطار کی دوکان بن کر رہ گیا۔ اور آپ فرماتے ہیں کہ کوئی علاج نہیں کیا۔"

"معاف کیجئے قصور ہوا۔ واقعی غور سے دیکھا جائے تو آپ کے شکم مبارک پر طبلۂ عطار کا دھوکا ہوتا ہے۔"

لاحول ولا قوۃ۔ تمہارے بے تکے پن سے ناک میں دم آگیا۔ کہاں روغن گل والا عطار، کہاں روحِ گلاب والا، کہاں طبلچی کا طبلہ اور کہاں عطار کا طبلہ"

جانے استاد خالی است میر صاحب۔ بھلا آپ کی عربی دانی کا میری ہیچ مدانی کیا مقابلہ کر سکتی ہے؟"

خیر بھئی اس دانی مدانی کو چھوڑو۔ آدمی سے چوک ہو ہی جاتی ہے ذکر اس کا تھا کہ اس قبض سے پیچھا چھڑانے کے لئے وہ کون سی تدبیر تھی جو ہم نے نہ کی ہو۔ اس کوشش میں ہمیں بے شرمی کی جن منزلوں سے گزرنا پڑا اس کی داستان بڑی عبرتناک ہے۔ پہلے دور میں جب ہم نے اس آبرو باختہ مرض کی ذات نہیں پہچانی تھی۔ شریف دواؤں کا استعمال کرتے رہے۔ جیسے گل قند، شربت ارزانی، شربت انجیر، پیٹرولاگر، ملک آف میگنیشیا، مگر توبہ، بھلا ہماری آنتیں اس شرافت کے برتاؤ سے ماننے والی تھیں۔ مجبوراً ہم نے کیسٹرآئل اور معجونِ لکونی جیسی کمینی چیزوں سے کام لینا شروع کیا۔ چند روز تک تو کچھ تھوڑا بہت نتیجہ نکلتا رہا مگر پھر کم بخت اوجھڑی اس طرح اینٹھ کر رہ گئی کہ کسی طرح ٹس سے مس نہ ہوتی۔ آخر ہم بالکل سفلی علاج یعنی ثنا نے عمل اینیما پہ اتر آئے۔ مگر اس میں بھی وہی قصہ ہوا کہ پہلے کچھ دن کرم دھرم

اور پھر ٹائیں ٹائیں فش ۔ ہم سمجھتے تھے کہ اب ذلت و رسوائی کا کوئی درجہ باقی نہیں رہا۔ مگر ہم بڑے دھوکے میں تھے۔ ابھی کچھ دن ہوئے ایک بزرگوار ملے جو قدرتی علاج کے ماہر کہلاتے ہیں۔ ان کو ہماری صورت دیکھ کر یہ غلط فہمی ہو گئی کہ یہ قبض محض ہمارے مگرے پن کی وجہ سے ہے۔ گویا ہم خاص کر کے کڑک ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ہمارے لئے پیٹ کی مالش کی نامعقول سزا تجویز کی ہے۔ دیکھئے ابھی قسمت اور کیا کیا دکھاتی ہے۔"

"میر صاحب آپ گھبرائیے نہیں، آپ کی مشکل حل ہو جائے گی آپ کے سب احباب خواہ مل کر دل سے دعا کریں گے کہ خدا آپ کی آنتوں کو کشاکش بخشے۔"

۲۴

۲۴ر جون ۱۹۵۰ء

"ہسٹری کیسی ڈاکٹر صاحب؟ اتنا سا بچہ۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش اس کی ہسٹری بھلا کیا ہو گی۔ ہاں اس کے باپ دادا کے کارنامے۔"

"نائیں، نائیں۔ کار کا بات چھوڑو۔ مرج کا بات بولو۔"

"قبلہ ہرج مرج تو آپ جانتے ہیں، انسان کی جان کے ساتھ لگا ہی رہتا ہے۔ مگر اس وقت ننھے کی بیماری نے اور سب باتیں بھلا دی ہیں اور اس کی ماں کا تو ہیں آپ سے کیا عرض کروں کیسا بُرا حال

ہے۔ایک تو یوں ہی دھان پان اور پھر ــــ"

"او بابا تم کیسا مانس ہے۔ہم بچّے کا حال پوچھتا ہے، تم ماں کا بتاتا"

"جی میں بن مانس نہیں۔اچھا خاصا بھلا مانس ہوں۔مگر آج کل ذرا بوکھلا سا گیا ہوں۔بات یہ ہے کہ میری تین بیویاں نامراد دنیا سے گئیں۔چوتھی بیوی کا پہلا ہی بچہ ہے۔اس کی بیماری نے گھن چکّر بنا رکھا ہے۔"

"تو بابو شاپ بیماری کیا ہے، کچھ بولو نا؟"

"بول تو میں برابر رہا ہوں۔مگر یہ بھلا میں کیسے بتاؤں کہ بیماری کیا ہے۔آپ مرض کی تشخیص مجھ سے کرانا چاہتے ہیں تو پھر آپ ڈاکٹر کاہے کے لئے بنے ہیں۔"

"ارے تم کچھ شیمٹوم دیکھا؟ کاہے سے معلوم ہوا بچہ بیمار ہے۔"

"یہ شیم ٹوم کیا بلا ہے ڈاکٹر صاحب، کوئی نئی بیماری ایجاد ہوئی ہے؟"

"شیمٹوم انگریجی میں الاموت کو بولتا ہے۔"

"کیسا موت؟ اچھا اب سمجھا۔یہ علامت کی خرابی ہے۔ظالم نے صرف پیش لگانے پر اکتفا نہیں کی۔واؤ کو بھی لے کر کھینچ دیا۔ارے ڈاکٹر صاحب آپ علامت کو کیا پوچھتے ہیں۔یہ بچہ تو سر سے پاؤں تک علامت ہی علامت ہے۔ایک تو بات بے بات اس بُری طرح حلق پھاڑ کر روتا ہے کہ چھت گرنے لگتی ہے اور کان کے پردے پھٹ جاتے ہیں۔اور کمال یہ ہے کہ آنسو ایک نہیں نکلتا۔پھر یہ بھی نہیں کہ دس بیس منٹ رو کر چُپ ہو جائے۔یہ بھونپو جہاں بجنا شروع ہوا دو دو تین تین گھنٹے تک بجتا ہی

چلا جاتا ہے۔ دوسرے کھانے پینے کا ہو کا اتنا بڑھ گیا ہے کہ خدا کی پناہ دودھ تو خیر شیر مادر ہی ہے دن رات پیتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ گھٹی، ٹہلا، الا بلا غرض کسی نہ کسی چیز کی چسکی جاری رہتی ہے۔ اور کھانے کی تو کچھ نہ پوچھیئے۔ دسترخوان پہ جو کچھ ہو سب میں سے تھوڑا تھوڑا چپا ناپڑتا ہے ورنہ رو کر سب کا دماغ چٹ کر جائے اور پھر اس کی کوئی قید نہیں کہ وہی چیز کھائے جو کھانے کی ہو۔ جیتے بٹے اور گڑیا کے سر سے لے کر صابن، منجن، کریم، جھاڑن، اسفنج، کاغذ، قلم، پنسل، چاقو، پیپر ویٹ روپیہ، اٹھنی، چونی، دونی، اکنی، ادھنا، پیسہ، غرض جو کچھ بھی منہ کے اندر پہنچ سکے اُسے چوسے گا چبائے گا یا نگل جائے گا۔ خیر یہاں تک بھی غنیمت ہے۔ اب چند روز سے صاحب زادے کو مردم خوری کا چسکا پڑ گیا ہے کسی کی انگلی ہو، کان ہو، بازو ہو یا جسم کا کوئی اور بھرا بھرا حصہ ہو اس کی زد میں آیا نہیں اور اس نے کچکچا کر کاٹا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایمان سے کہتا ہوں کہ بس خدا ہی یاد آ جاتا ہے۔ ابھی پرسوں چھوٹے ڈاکٹر صاحب کو دکھایا تھا انھوں نے فرمایا کہ اس کا ٹمپریچر چارٹ رکھو تو حضرت میں تھرمامیٹر خرید کر لایا اور صاحبزادے کے منہ میں رکھنا چاہتا تھا کہ بس مچل گئے۔ تھرمامیٹر تو زمین پہ گر کر چور چور ہو گیا اور میری انگلی اس کے دانتوں میں آ گئی۔ بس پھر کچھ نہ پوچھیئے۔ آنکھوں میں ایک بجلی سی چمکی اور درد کی لہر سارے بدن میں دوڑ گئی۔ دیکھنے میں تو ۴، ۶ چھوٹی چھوٹی چوہے دنتیاں ہیں مگر ان میں اس بلا کی کاٹ ہے کہ میرا ہی دل جانتا ہے

تو مدعا یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کہ اور چاہے جو علاج تجویز کیجئے مگر اس موذی ٹمپر بچہ چارٹ کا نام نہ لیجئے گا۔"

" بابو بتا آپ بچے کو ایلاج کا کچھ جرورت نائیں۔ تم اپنے دماگ کا ایلاج کرائے۔"

"ہائیں! یہ کیا بک رہا ہے، یعنی ہیں، ہیں، ہیں۔ اپنے اپنے۔"

۲۵

یکم اگست ۱۹۶۵ء

" آئیے آئیے۔ بڑی دیر کی آپ نے۔ راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں۔"

" ہونھ! آپ دیر لئے پھرتے ہیں، یہی غنیمت سمجھئے کہ اس گلی سے صحیح سلامت گذر کر آپ تک پہونچ گیا۔"

" ماشاء اللہ! یہ گلی کیا کوئی ہفت خواں ہے جو اس کے سر کرنے میں آپ کو اس قدر دقت پیش آئی۔"

" مجھے تو یہ بھاگوان ہفت خواں کی بڑی بہن معلوم ہوتی۔ ہفت خواں میں آنریبل رستم جی کو فقط جان ہی کا خطرہ تھا اور یہاں ہر قدم پہ جان کیساتھ آبرو کی بھی بازی لگانی پڑی۔"

" آخر کچھ تو بتائیے آپ کے دشمنوں کی جان اور آبرو کون لے رہا تھا اور کیوں لے رہا تھا۔

"میں نہیں چاہتا کہ اپنی رسوائی کی داستان سے آپ کی سمع خراشی کروں
مگر آپ نہیں مانتے تو سنئے۔ مختصر قصۂ غم یہ ہے کہ میں سڑک سے مڑ کر اس نیک بخت
گلی میں دو ہی چار قدم چلا ہوں گا جو ایکدم سے ایسا معلوم ہوا جیسے خواجہ
عمر عیار نے کمین گاہ سے داروئے بیہوشی کا حقہ کھینچ مارا ہو، کچھ نہ پوچھئے
کیسا ہوشربا بھبکا تھا جس نے ناک سے لیکر دماغ تک ہلچل مچا دی۔ میں چکرا کر
گرنے والا ہی تھا کہ جنگ کے زمانے کی ایک سُنی سنائی بات یاد آگئی۔ جب
زہریلی گیس کا بم پھٹے تو اس سے دور بھاگتے ہوئے جتنی دیر ہو سکے سانس
اندر مت لو بلکہ نکالتے رہو۔ چنانچہ بڑی تیزی سے میں نے نتھنوں کی دھونکنی سے سوں
سوں دھونکنا شروع کر دیا مگر مشکل یہ تھی کہ زہریلی گیس سے بھاگنے کے بجائے
مجھے عین اسی طرف جانا تھا جدھر سے اس کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ خیر قہر درویش
بر جان درویش کچھ دور چلنے کے بعد اس قاتل گیس کا خزانہ عامرہ جسے گھریلو زبان
میں گھورا کہتے ہیں۔ آدھی گلی کو گھیرے ہوئے نظر آیا اور باقی آدھی میں ایک کوٹھے
کے اوپر سے ایک بہت مفصل پرنالہ گر رہا تھا۔ خدا جانے کون کبوتر بامِ حرم اپنے
جسم کے میل کو رفاہِ عام کیلئے بے دریغ بہا رہا تھا۔ اس مرحلہ پر پہونچکر میں ایک
لمحے کیلئے ٹھٹکا مگر پھر خیال آبروئے ہمت مردانہ نے اُکسایا تو ایک زقند میں گھورے
کو صاف پھاند گیا مگر پرنالے نے چلتے چلاتے ایسا چھینٹا دیا کہ کپڑے "پوشش
چھینٹ قلم کار" بنکر رہ گئے اور جوتے پاؤں سمیت کیچڑ میں جو گھورے اور پرنالے
کے اشتراک عمل سے دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ لت پت ہو گئے۔ بس کچھ نہ پوچھئے تیرک کے
اور کیچڑ کے مارے ایک ایک پاؤں سو سو من کا اور ایک ایک قدم ہزار ہزار قدم کا معلوم

ہورہا تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح آگے کھسکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گلی کی چوڑائی میں خوفناک قسم کی بطخیں پرا باندھے کھڑی ہیں مجھے دیکھتے ہی ان دیش بھگتوں نے حکومت کی پالیسی اور کانگریس کی آپسی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر دی اور نہ جانے میرے کھدر کے پاجامے سے چڑ کر یا اس میں لسی ہوئی کیچڑ سے خوش ہو کر سر اُٹھائے چونچیں کھولے میری طرف لپکیں میں نے گھبرا کر پیچھے کی طرف دیکھا کہ راہ فرار کا جائزہ لوں تو وہاں گھورے اور پرنالے کے علاوہ کہیں سے ایک لحیم شحیم سانڈ آ نکلا تھا۔ جس کے نوکدار سینگ سورج کی ہلکی ہلکی روشنی میں آلہ دھاردار کی طرح چمک رہے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ حضرت خراماں خراماں میری طرف بڑھ رہے تھے۔ اب میرا یہ حال کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ زیادہ سوچنے کا وقت نہ تھا میں نے فوراً یہ فیصلہ کیا کہ پائے ماندن کا معاملہ بہرحال زیادہ خطرناک ہے۔ اس لئے جائے رفتن کسی نہ کسی طرح نکالنی ہی چاہیئے۔ چنانچہ دانت بھینچ کر اور آنکھیں بند کر کے میں ایک ہلّے میں بطخوں کی صف کو چیرتا ہوا نکل گیا لیکن توبہ یہ بطخیں بھی غضب کی کینہ پرور ہوتی ہیں۔ انھوں نے فوراً پلٹ کر شمالی کوریا کی فوجوں کی طرح میرا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ اب ذرا اس منظر پر غور کیجئے۔ آزاد با اقتدار ہندوستانی ریپبلک کا ایک معزز شہری سر پہ پاؤں رکھے بھاگ رہا ہے اور بطخوں کا شیطانی لشکر اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ اس وقت گلی میں لونڈے نہ تھے ورنہ لو لو بول دیتے۔ سو حضرت ہم نے تو آج سے کان پکڑے یہ دلی کی گلیاں آپ کو اور استاد ذوق کو مبارک ہوں ہم تو ان میں قدم رکھنے کے نہیں۔ ع نہ بھائی ہماری یہ طاقت نہیں ہے۔"

۲۶

۲۴ جولائی ۱۹۵۰ء

"کوئی میر صاحب بہادر ہیں؟ کہئے کیا خبر ہے؟"

"اے سبحان اللہ! کیا تمیز داری ہے! نہ دعا، نہ سلام، نہ مزاج پرسی، بس ایک ڈھیلا سا کھینچ مارا "کہئیے کیا خبر ہے"۔ میں کوئی پرچہ نویس ہوں، شہر خبریا ہوں، آخر ہوں کون؟"

"توبہ، توبہ، شہر خبریے ہوں آپ کے دشمن، آپ تو میر خبر ہیں، میر خبر۔"

"بھئی واہ، واہ، وا! یہ میر تُکار کے جوڑ پہ میر خبر کی خوب رہی پھبتی کی داد تو ہم سولی پر بھی دینگے۔ چاہے ہم ہی پرکیوں نہ ہو۔ مگر تم لوگوں کو ہمارے متعلق بڑی غلط فہمی ہے۔ ہم کو اخبار کا اتنا شوق ہے۔ وہ خالی خبریں پڑھنے کے لئے تھوڑی ہے"۔

"اور کیا ثواب بٹورنے کے لئے ہے"۔

"جی ایک ثواب بٹورنا کیا اخبار تو طالب علم کی لنگی سے بڑھ کر ہے اس سے جو کام چاہو لے لو۔ طالب علم کی لنگی کی یہی صفت ہے نا کہ بچھائیے تو نرم، اوڑھئیے تو گرم، باندھئیے تو بھرم، دیکھئے تو دھرم؟ اب اخبار کو دیکھئے کہ کس کس طرح استعمال ہوتا ہے۔ میز پوش یا دسترخوان کی طرح بچھاتے اس کو ہیں پنکھا اس سے جھلتے ہیں۔ مکھیاں اس سے مارتے ہیں۔ انگیٹھی اس سے سلگاتے ہیں۔ انگوٹھے اور کلمے کی انگلی سے مسل کر بتیاں اس کی بناتے ہیں اور جو بچ رہے اسے ردی میں بیچ ڈالتے ہیں کہ پڑیا بنانے کے کام آتے۔ آم کے آم اور گٹھلی کے دام"۔

"تو پھر لگے ہاتھوں یہ بھی کہہ ڈالئے کہ اضطراری حالت میں اس سے طہارت کا کام لیتے ہیں"۔

"وہ تو خیر تم جیسے نجس لوگ کرتے ہوں۔ البتہ قبض کے دور کرنے میں ہم بھی اخبار سے مدد لیتے ہیں"۔

"کیسے میر صاحب یہ نسخہ تو ہمیں بھی بتایئے۔ اچھا سمجھ گیا، شافہ ــــ"

"استغفر اللہ! تم اپنی شیطنت سے باز نہ آؤ گے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ جن لوگوں کو قبض کی وجہ سے بہت دیر تک بیٹھنا پڑتا ہے۔ وہ وقت کاٹنے کے لئے عام طور پہ اخبار پڑھا کرتے ہیں۔"

"سچ کہا آپ نے۔ میں نے بہت سے حضرات کو دیکھا ہے کہ صبح تڑکے سے اخبار کے تازہ تازہ پرچے کا انتظار کیا کرتے ہیں اور جیسے ہی آتا ہے اسے لیکے چلے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ مگر یہ آپ کیسے کہتے ہیں کہ یہ اہل حاجت محض وقت کاٹنے کیلئے اخبار پڑھتے ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں اخبار میں ضرور کچھ مسہل کی خاصیت ہوگی۔ ورنہ ایسے موقعوں کیلئے تو آجکل کا افسانوی ادب سب سے موزوں ہے۔ اسے چھوڑ کر لوگ روکھے پھیکے اخبار کا ناشتہ کیوں کرتے۔ البتہ ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہر شخص کو کشودِ کار کیلئے کسی مخصوص اخبار کی ضرورت کیوں ہوتی ہے۔ مثلاً ایک دوست ہیں جنھیں پانیر کے بغیر کھل کر اجابت نہیں ہوتی۔ اگر کسی دن دھوکے میں اخبار والا امرت بازار پتریکا دے جاتے تو وہ کھڑک بیٹھ جاتے ہیں اور ان کا پیٹ پھول کر رہ جاتا ہے۔ ایک اور صاحب ہیں جن کی مشکل اسٹیٹسمین کے بغیر حل نہیں ہوتی۔ نیشنل ہیرلڈ سے انھیں پیچش کی شکایت ہو جاتی ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے اگر کوئی اخبار ملین ہے یا نفاخ ہے یا مروڑ کرتا ہے تو اس کا اثر سب پہ یکساں ہونا چاہئے۔"

"واللہ تم مسخرے پن میں کبھی کبھی پتے کی بات کہہ جاتے ہو۔ اخبار کی ان خاصیتوں پر تم نے غور نہیں کیا تھا۔ مگر تمہیں اس پہ تعجب کیوں ہے کہ لوگوں پر مختلف اخباروں کا اثر مختلف ہوتا ہے۔ یہ تو اپنا اپنا مزاج اور اپنا اپنا ظرف ہے۔ ایک شخص کو ایک چیز سے

انقباض ہوتا ہے۔ دوسرے کو اسی چیز سے انبساط ہوتا ہے۔"

"چاہئے استادِ خالیت، میر صاحب آپ اپنے قبض و بسط کے عقدے کو جس خوبی سے کھولیں وہ آپ ہی کا حصّہ ہے اور ہونا بھی چاہئے۔ ع

کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزل ہا"

۲۷

۴ر اگست سنہ ۵۰ء

"چشم بد دور! یہ مقطع چقطع بوزنہ وا صورت اور ہاتھ میں یہ بید ولتاری کھرپا؟ کیا مچھلی کے شکار کیلئے کیچوے کی تلاش ہے جو یہ کرید ہو رہی ہے؟"

"لاحول ولا قوۃ! میں مچھلی کے شکار کو جھک مارنا سمجھتا ہوں اور کیچوے پکڑنے کو تو کیا کہوں۔"

"جی جھک مارنے کے ساتھ کا دوسرا محاورہ موجود ہے۔ بے تکلف شوق فرمایئے مگر یہ تو بتاؤ آخر آج کون سی ہوا چلی ہے جس نے میاں خسرو کو کوہ کن بنا دیا؟"

"خدا جانے تم کس خوابِ خرگوش میں پڑے ہو، سارے ہندوستان میں دھوم مچی ہوئی ہے۔ اور تم کو خبر تک نہیں کہ ہمارے آنریبل منسٹری شری منشی نے دن مہوتسو شروع کیا ہے اور دیش بھگتوں سے اپیل کی ہے کہ زمین کے ایک ایک چپے پر درخت لگائیں لہٰذا ——"

"ذرا لہٰذا کی باگیں روکے ہوئے۔ پہلے اس اشلوک کے معنی سمجھاؤ۔ دن تو ہم تاڑ لئے کہ بن کی شدھی ہے اور مہہ مہا کا مخفف ہے مگر یہ اتسو کیا کوئی جوجتسو کا جوڑ ہے؟"

"اُت سُو نہیں، اُتسو۔ الف پر زبر ہے اور واؤ کا تلفظ مزے لے لے کر کیا جاتا ہے جیسے LOVE میں۔ دن مہوتسو درخت لگانے کا عظیم الشان جشن

ہے جو ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک منایا جا رہا ہے۔ جدھر دیکھئے ہلچل مچی ہوئی ہے۔ بڑے بڑے لوگ قوم کے مالی بنے ہوئے درخت لگا رہے ہیں، ان کی تصویریں کھینچتی ہیں اور اخباروں میں شایع ہوتی ہیں۔"

"واللہ تمہیں بھی کوئی اُن جان اس وقت دیکھے تو یہی سمجھے کہ قوم کا مالی ہے۔ مگر استاد یہ کھرپا بہادر بننے کی لم اب سمجھ میں آئی۔ یہ وہی قصہ ہے۔ ع
نہال خاکساری کو لگا کر ہم نے پھل پایا

فوٹو گرافر کو بلوایا گیا ہوگا اور یہ تصویریں کھچوا کر اخباروں کو بھیجی جائینگی کہ
بہر خدا ہمیں بھی کہیں چھاپ دیجئے ع

توبہ! توبہ! تم نے مجھے ایسا شہرت کا کنگلا سمجھا ہے۔ میں نے کسی فوٹوگرافر کو نہیں بلوایا۔ ہاں لڑکے ضد کر رہے ہیں کہ درخت لگاتے ہوئے میری تصویریں لیں گے اب اگر کوئی اخبار لیکر چھاپ دے تو میں اس کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے تو یہ فکر کھائے جاتی ہے کہ کسی طرح ہمارے ملک کی غذا کا مسئلہ حل ہو اور بھوکوں کا پیٹ بھرے جس کے لئے شری منشی نے یہ مہم شروع کی ہے۔"

"ظاہر ہے ملک کے بھوکوں کا درد تمہاری پھولی ہوئی توند میں نہ ہوگا تو کیا ہمارے پچکے ہوئے پیٹ میں ہوگا مگر یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ اس پیڑ بازی سے غذا کا مسئلہ کیسے حل ہو جائے گا۔"

"وہ بات ہی کیا ہوئی جو تمھاری سمجھ میں آجائے۔ ارے عقل مند جب ان درختوں میں پھل آئیں گے اور لوگ انھیں نوش جاں فرمائیں گے تو اناج کا خرچ کم ہوگا یا نہیں ہوگا اور جب درختوں کی کثرت سے بارش زیادہ ہونے

لگے گی تو غلّے کی پیداوار بڑھے گی یا نہیں بڑھے گی۔"

"واہ رے میرے وناسپتی شیر، کیا کہنے ہیں تیری کمی اور زیادتی کے۔ ارے بندۂ خدا یہ بھی تو سوچ کہ جب تک یہ بیل منڈھے چڑھے گی۔ ان لوگوں کا کیا حشر ہوگا جو آج بھوکوں مر رہے ہیں۔"

"اب اس کا تو کوئی علاج ہی نہیں کہ ایک زرا سا قحط اور قحط بھی کہاں غلّے کی ایک زراسی کمی ہوئی اور شور مچ گیا کہ مر گئے۔"

"واقعی ہندوستانیوں کی یہ جلد بازی ہمیں بھی پسند نہیں کہ ایک زری سی موت آئی اور مر گئے۔ خیر آپ ان موؤں کی پرواہ نہ کیجیے۔ حال کو گوڑ کر مستقبل کی پود لگاتے رہیئے۔ ایک دن آئے گا جب ہرے بھرے درخت میووں سے لدے ہوں گے اور یہ جلد باز مرنے والے پچھتائیں گے کہ کاش ع

کوئی دن اور بھی جیئے ہوتے